جلد: ۹۳ | جمادی الاولیٰ - جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ مطابق مئی - جون ۲۰۰۹ء | شمارہ: ۵ - ۶

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپئے، سالانہ -/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۰۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

کانگریس پارٹی کیلئے لمحۂ فکریہ

حبیب الرحمٰن اعظمی

ایک طویل مشترکہ جدوجہد کے بعد وطن عزیز سامراج کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوا تو اس وقت کے قائدین کی (جن کی اولی العزمیوں اور بے پناہ قربانیوں کے نتیجہ میں ہندوستانی قوم غلامی کی ذلت سے نجات پاکر آزادی کے شرف ومجد سے ہم کنار ہوئی تھی) ذات و مذہب کے لحاظ سے یہاں کی مختلف النوع آبادی، اور رنگارنگ تہذیب وثقافت کے پیش نظر متفقہ رائے ہوئی کہ کسی خاص مذہب وقوم کی حکومت کی بجائے یہاں سیکولر بنیادوں پر جمہوری نظامِ حکومت ہی کامیاب، بارآور، اور ملک وقوم کے استحکام وترقی اور فلاح و بہبود کا ضامن ہوسکتا ہے، بلاشبہ ملک کے یہ معمار اپنی اس رائے میں نہایت مخلص تھے اوران کا یہ فیصلہ ملک کی مشترکہ آبادی کے لحاظ سے صدفی صد درست تھا، جسے آج دنیا تسلیم کررہی ہے اوران کی سیرچشمی و بالغ نظری کو سلام کررہی ہے، ان کے اسی فیصلہ کی بدولت آج ہمارے ملک کو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

اور یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ بعض تنگ دل، کج فکر اور مفاد پرست سیاسی پارٹیوں کی مخالفت کے باوجود ملک میں جمہوریت کی جڑیں مستحکم ہیں اور ملک کی اکثریت بلکہ اکثریت سے بھی اکثر ذات وقوم اورتہذیب و مذہب کی سیاست کے مقابلہ میں سیکولر جمہوری نظام کو ہی پسند کرتے اورترجیح دیتے ہیں، اور بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ملک کے سیکولر سیاسی رہنما وقتی جذبات، ذاتی مفاد اور غرض آمیز مصلحتوں سے بلند ہوکر بغیر کسی فرق و امتیاز کے پوری ہندوستانی قوم کو جمہوریت کے فوائد وثمرات سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرتے تو آج ہندوستان میں کوئی ان کا حریف اور مدمقابل نہیں ہوتا اور ملک میں صرف اورصرف جمہوریت ہی کا بول بالا ہوتا۔

خود کانگریس پارٹی کی عبرت انگیز تاریخ سامنے ہے، جو ملک کی سب سے قدیم اور سب سے پرانی سیکولر سیاسی پارٹی ہے، جسے یہ تاریخی عزت وعظمت حاصل ہے کہ اسی کی قیادت میں اور اسی کے جھنڈے تلے آزادی کی جنگ لڑی گئی اور کامیابی سے ہم آغوش ہوئی، اسی کانگریس پارٹی نے جب سیکولر اور جمہوریت کا دم بھرنے کے باوجود اپنے سیکولر کردار کو خود اپنے ہاتھوں مجروح کردیا اور نہ جانے کن ذہنی تحفظات کے تحت اس کے اہل کار ملک کی ایک بڑی آبادی کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم کردینے کے درپے ہوگئے تو ہندوستانی قوم نے اسے برداشت نہیں کیا اور اس کی تمام تر ملکی وقومی خدمات کے باوجود اسے ایوان اقتدار سے بے دخل کردیا، کانگریس پارٹی کی اسی ترقیٔ معکوس کے نتیجے میں فرقہ پرست طاقتوں کو فروغ حاصل ہوا، ذات وبرادری کی بنیاد پر علاقائی سیاسی پارٹیوں کا وجود عمل میں آیا، اور ملک کی سیاست میں نامناسب وغیر پسندیدہ عناصر کا عمل دخل بہت بڑھ گیا، جس کی وجہ سے ملک میں نہ صرف امن وسلامتی، انصاف وقانون، استحکام وترقی کی حالت ابتر ہوگئی، بلکہ خود سیاست کا اخلاقی معیار نہایت پست ہوگیا جو ایک عظیم قومی خسارہ ہے۔

اب ادھر حالیہ سالوں میں کانگریس پارٹی کی سربراہی میں قائم حکومت نے مسز سونیا گاندھی اور جناب منموہن سنگھ کی کوششوں سے اصلاح حال کی طرف توجہ دی ہے اور حالات میں اگرچہ برائے نام ہی سہی سدھار بھی پیدا ہوا، تو ملک کے عوام، بالخصوص مسلم اقلیت جس نے کانگریس پارٹی سے مایوس ہوکر دیگر علاقائی پارٹیوں سے رابطہ قائم کرلیا تھا، حالیہ انتخاب میں اس کا رجحان پھر کانگریس کی طرف ہوگیا جس کا اثر یہ ہوا کہ کانگریس پارٹی جو خود اپنی طرف سے ایک حد تک مایوس تھی اور اس کے لیڈران دیگر پارٹیوں سے حمایت حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف تھے، حیرت انگیز طور پر اپنے تمام حریفوں کو پیچھے چھوڑ کر کامیابی کی اس منزل پر پہنچ گئی جس کا اس الیکشن میں اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ مسلمان ملک میں اقلیت میں ہیں تنہا اپنے ووٹوں سے کسی امیدوار کو کامیاب نہیں کرسکتے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک جانی مانی سچائی ہے کہ ہندوستان میں صرف مسلم اقلیت کا عددی تناسب اپنے اندر ایسا وزن رکھتا ہے، کہ یہ جس کی طرف جائیں گے اس کا پلڑا بھاری ہوجائے گا، مسلم ووٹوں کی اس حیثیت کا ادراک تمام سیاسی پارٹیوں اور ان سے وابستہ لیڈروں کو بھی ہے۔ جس کا اچھی طرح اندازہ الیکشن کے موقع پر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنھیں منھ پھیر کر مسلمانوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا ہے، وہی انتخاب کے

زمانے میں مسلمانوں کی خوشامد و مدارات کرتے نظر آتے ہیں۔

پھر کانگریس کو یہ کامیابی ایسے حالات میں حاصل ہوئی ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں اپنے طے کردہ ایجنڈا کے مطابق اپنی کامیابی کا یقین کئے ہوئے تھیں اور ایک کے بجائے اپنے دو دو متوقع وزیر اعظم کے ناموں کا اعلان بھی کردیا تھا، بعض علاقائی پارٹیوں کی طرف سے بھی وزارت عظمیٰ کی دعویداری بڑی شدومد سے کی جارہی تھی، تیسرے محاذ کے نام سے قائم ایک کانگریس مخالف محاذ بھی اس دوڑ میں شامل ہوگیا تھا۔ کانگریس پارٹی کے بہت سے حلیف کانگریس کے حق میں حالات ناسازگار دیکھ کر اس سے ناطہ توڑ کر اپنا الگ سے ایک محاذ بنالیا تھا، بظاہر حالات ایسے تھے جس میں کانگریس پارٹی کے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی، ایسی مایوس کن صورت حال میں ایک ہلکی سی امید پر مسلم اقلیت نے کانگریس کی طرف دستِ تعاون بڑھایا اور اپنے کرشماتی عددی تناسب سے کانگریس کے واسطے باعزت طور پر ایوان اقتدار تک پہنچنے کی راہیں ہموار کردیں۔

بلاشبہ مسلم اقلیت نے اس موقع پر اپنی دانشمندی اور وطن دوستی کے تقاضوں اور ذمہ داریوں کا پاس ولحاظ رکھا ہے، اور ملک کو فرقہ پرستی کی آگ میں جلنے سے بچالیا ہے۔ اب کانگریس پارٹی کی جمہوریت اور سیکولر پسندی کا امتحان ہے اگر وہ اس پنج سالہ امتحان میں کامیاب ہوجاتی ہے تو پھر اسے یقین کرلینا چاہیے کہ کامیابی کی گینداسی کے پالے میں گرے گی، بصورت دیگر جو حشر ہوگا اس کے ذکر کی ضرورت نہیں کیوں کہ بذات خود وہ اس کا تجربہ کرچکی ہے، بلکہ اس تجربہ سے وہ ابھی پوری طرح باہر نہیں نکل سکی ہے۔

ملک کا ایک تسلیم شدہ آئین و دستور ہے۔ جس میں حکومت اور عوام کے اختیارات وحقوق مصرح ہیں اس دستور میں ملک کی اقلیتوں کو اکثریت کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا گیا ہے، بلکہ انھیں تمام شعبۂ زندگی میں مساوی حق دیا گیا ہے۔ قانون وانصاف کے مطابق کسی فرق وامتیاز کے بغیر یہ حقوق ان کے حقداروں تک پہنچنے چاہئیں، حکومتیں اور ان کے اہل کار عوام تک حقوق رسانی میں جب ذات ومذہب کی بنیاد پر فرق وامتیاز کرنے لگتے ہیں تو پھر سیکولر و جمہوری قدریں مجروح ہوتی ہیں اور باہمی کشمکش کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، مسلم اقلیت کو شکایت یہی ہے کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے، سچر کمیٹی نے ان کی اس شکایت کو حرف بحرف سچا ثابت کردیا ہے، حکومت نے جس ہمت و جذبہ کے ساتھ خود اس کمیٹی کی تشکیل کی تھی، اسی حوصلہ اور نیک نیتی کے ساتھ اس کی سفارشات پر عمل درآمد کرنا چاہیے، یہ حکومت کے ذمہ مسلم اقلیت کا حق ہے، خود محترمہ سونیا گاندھی

نے رام پور میں اپنی تقریر میں کہا تھا اگر ہمیں موقع دیا گیا تو سچر کمیٹی کی سفارشات کو پورے طور پر نافذ کیا جائے گا۔ اب یہ موقع انھیں حاصل ہوگیا ہے، اب دیکھنا ہے کہ وہ اپنے اس وعدہ کو پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہیں، ویسے ان کے طرز فکر سے یہی توقع ہے کہ وہ اپنے وعدہ کو یاد رکھیں گی اور اس کے پورا کرنے میں دانستہ کوتاہی نہیں کریں گی، اور خود وزیر اعظم نے بھی ایک موقع پر کہا تھا مسلم اقلیت زندگی کی راہ میں جس طرح پیچھے رہ گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اسے دوگنے مواقع فراہم کیے جائیں۔ اب یہ مواقع خود ان کے ہاتھوں میں ہیں اور پہلے کی طرح ان کا ہاتھ بندھا بھی نہیں ہے، اس لئے انھیں اپنے اس صحیح احساس کو بروئے کار لانے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، وہ بھی ایک صاف ستھرے امیج کے مالک ہیں اور کہنے کے ساتھ کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے حریف کے مقابلہ میں بارہا کیا ہے اس لئے ہمیں بجا طور پر ان کی اس بلند حوصلگی کے ثمرات کا انتظار ہے۔

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

دوسری قسط

قرآن محکم کی شانِ عظیم

از: رشید احمد فریدی
مدرسہ مفتاح العلوم، تراج ضلع سورت

قرآن کا رسم الخط اور قرأتِ متواترہ کا بیان

ہر زبان کا ایک طرزِ ادا ہوتا ہے اور ایک طریقۂ خط۔ دونوں کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں جن کے مطابق پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ عربی زبان دنیا کی وسیع تر زبانوں میں سب سے اعلیٰ واشرف اور وسیع ترین ہے علمائے عربیت نے اس کے اصول وقوانین بیان کیے ہیں وقد مهد النحاة اصولاً وقواعد. (۱) کلام الٰہی کا آخری نسخہ قرآن پاک اسی عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور قواعد عربیت کا سرچشمہ اور مخزن ہے اِنَّا انزلناه قرء'ناً عربيًا(۲)۔ اب یہاں دو امر قابل لحاظ ہیں: (۱) ایک یہ کہ قرآن مجید عربی قواعد واصول کے موافق ہونے کے باوجود ایک خاص فوقیت کا حامل ہے وہ یہ کہ عربی زبان تو اپنے اصول وقواعد میں کلام اللہ کی خوشہ چیں ہے مگر قرآن خود قائد ہے اس کا تابع نہیں ہے۔ اسی لیے بعض مقام پر عام نحوی قواعد کی مطابقت نظر نہیں آتی ہے۔ (۲) دوسرا امر یہ ہے کہ قرآن مجید کی کیفیت ادا، جس طرح جداگانہ اور ممتاز ہے اسی طرح اس کا رسم الخط بھی انوکھا اور امتیازی شان لیے ہوئے ہے یعنی قرآن پاک کا اپنا ایک مخصوص رسم الخط ہے اور وہ اسی کا پابند ہے خواہ عام رسم الخط کے اصول کے موافق نہ ہو وقد خالفها في بعض الحروف خط الامام المصحف (۳) اس کی نظیر ایسی سمجھئے جیسے فن عروض کا خط جس میں اشعار لکھے جاتے ہیں کہ وہ عام اصول خط کے خلاف ہوتا ہے اور شاعر اپنے کلام کو اسی کے مطابق وزن کے سانچہ میں ڈھال لیتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے۔ خطان لايقاسان خط العروض وخط القرآن (۴) یعنی دو خط قیاسی نہیں ہیں ایک فن عروض کا خط، دوسرے قرآن کریم کا خط۔ علامہ طاش کبری زادہ صاحب مفتاح السعادۃ نقل کرتے ہیں: قال عبدالله بن درستويه في

کتابه فی الخط والهجاء "خطانِ لایقاسان خط المصحف لانه سنة وخط العروض لانه یثبت فیه ماثبته اللفظ ویسقط عنه ما اسقطه"(۵)۔

قرأة متواترہ کی اصلیت

حدیث اُنزل القرآن علی سبعة احرف یعنی قرآن سات مختلف طُرقِ ادا پر نازل کیا گیا ہے۔ یہ حدیث ۲۱؍صحابہ کرام سے مختلف الفاظ میں مروی ہے ابوعبید قاسم بن سلاّم نے اسے متواتر بتایا ہے(۶) خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شروع میں قرآن کو ایک طرز یعنی قبیلۂ قریش کے طریق ادا پر پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا مگر عرب کے دوسرے قبائل جن کا طریق ادا قریش سے جداگانہ تھا ان کے لیے قریش کے طرز ولہجہ میں پڑھنا طبعی وفطری ذوق کے اعتبار سے گراں تھا جیسا کہ ہر علاقہ کی زبان میں بُعدِ مسافت کی وجہ سے لب ولہجہ میں فرق ہوا کرتا ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے اپنی پوری امت کے لیے سہولت وآسانی کی دعا فرمائی اور دوسرے طریق میں پڑھنے کی اجازت طلب فرمائی بار بار کی التجا، پر سات (بلکہ اس سے زائد) طریقوں سے پڑھنے کی اجازت مرحمت ہوئی عن ابیؓ بن کعب ... اِن الله یامرك اَن تقرأ امتك القرآن علی سبعة احرف فایما حرف قرء وا علیه فقد اصابوا(۷)۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو انہی مختلف انداز سے قرآن کریم کی تعلیم دی پھر جس صحابی نے جس طرح تعلیم پائی تھی اس کو سینہ سے لگایا، ذہن میں بسایا اور دوسروں تک پہونچایا یہاں تک کہ یہ مختلف قرأتیں صحابہ کرام میں عملاً رائج اور معروف ہوچکی تھیں۔اور رسول اکرم ﷺ اپنی حیات مبارکہ میں قرآن مجید کو جن جن چیزوں میں لکھوا کر ضبط فرمایا کرتے تھے حضرت صدیق اکبرؓ نے جب اپنی خلافت میں قرآن کریم کو منتشر چیزوں سے اکٹھا کرکے اوراق میں جمع کروایا تو جمع کردہ یہ قرآن دیگر خصوصیات کے ساتھ مذکورہ بالا احرف سبعہ کا بھی حامل تھا ولا یعزبَنّ عن بالك ان هذا الجمع کان شاملاً لاحرف السبعة التی نزل فیها القرآن(۸) اعلم ان جماهیرالعلماء من السلف والخلف وائمة المسلمین ذهبوا الی ان المصاحف العثمانیة مشتملة علی ما یحتمله رسمها من الاحرف السبعة التی انزل بها القرآن جامعة للعرضة الاخیرة التی عرضها النبی صلی الله علیه وسلم علی جبریل متضمنة لها لم یترك حرفا منها لان الصحابة اجمعوا علی نقلها من المصحف الذی کتبه

ابوبکر وعمر واجمعوا علی ترك ماسوی شيء من القرآن كذا قاله الجزری فی النشر ولذلك لایجوز مخالفة المصاحف العثمانية فی الكتابة(۹)۔ اوراس مجموعہ بین الدفتین کا نام خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ نے مشورہ سے ''مصحف'' تجویز فرمایا۔(۱۰)

رسم عثمانی کی اہمیت وفرضیت

پھر قرّاء صحابہ میں سے جو جس علاقہ میں رونق افروز ہوئے وہاں کے لوگوں کو انھوں نے اپنے طریق عمل، طرزِ تعلیم اور کیفیتِ اداء سے روشناس کرایا چنانچہ کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت، ملک شام میں حضرت اُبی بن کعبؓ کی قرأت اوریمن وغیرہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی قرأت مشہور ومقبول ہوئی(۱۱)۔ انما كان كل صحابی فی اقليم يُقرئهم بما يعرف فقط من الحروف التی نزل عليها القرآن(۱۲)۔

بہرحال قرآن پاک کو مختلف کیفیات سے پڑھنے کی جس طرح صریح اجازت شریعت کی طرف سے دی گئی تھی اس طرح قرآن لکھنے کے لیے رسم الخط کی نہ تو عام اجازت تھی اور نہ کسی رسم الخط پر صراحتاً کوئی پابندی تھی۔ اس لیے اپنی اپنی پسندیدہ قرأت کے مطابق قرآن کی نقل کا سلسلہ بھی جاری تھا جس کے نتیجہ میں قرآن مجید کے مختلف نسخے وجود میں آگئے تھے یہاں تک کہ اختلافِ رسم (مع اختلاف قرأت) کی وجہ سے رفتہ رفتہ امت میں سنگین صورتِ حال پیدا ہوچلی تھی۔ صاحب السیر (رازدارِ رسول ﷺ) حضرت حذیفہؓ کی حساس طبیعت نے کتاب اللہ کے متعلق امت میں ہونے والے فتنہ کو بھانپ لیا اور دربار خلافت میں یہ کہہ کر استغاثہ فرمایا ادرك هذه الامة قبلَ ان يختلفوا اختلاف اليهود والنصاری(۱۳) یعنی قبل اس کے کہ امت یہود ونصاریٰ کی طرح گمراہی کے بھنور میں پھنسے امت کی کشتی کو سنبھالیے اور اس کو بچایئے۔ خلیفۂ رسول حضرت عثمان غنیؓ نے امت کو اختلاف کے گرداب سے بچانے اور ساحل عافیت پر لانے کے لیے اصحاب بصیرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ کیا چنانچہ قرآن پاک کی ازسرِ نو کتابت کے لیے چار آدمیوں عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمٰن بن الحارث، اور زید بن ثابت پر مشتمل ایک جماعت مقرر فرمائی اور کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو ذمہ دار ٹھہرایا اور مصحف ابی بکر کو جو قرآن کا اولین مجموعہ اور مستند ترین نسخہ تھا سامنے رکھ کر اس کی نقل تیار کرنے کا حکم دیا اور یہ خاص ہدایت دی اذا احتلفتم انتم وزيد بن ثابت فی شيء من القرآن فاكتبوه

بلسان قريش فانما نزل بلسانهم(۱۴) کہ جس کلمہ کی کتابت میں قریش وغیر قریش کا اختلاف ہوتو اسے قریش ہی کی لغت پر لکھا جائے اس لیے کہ قرآن پاک انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

چنانچہ چار بلکہ سات نقلیں اس طرح تیار کی گئیں کہ قراٴتِ مختلفہ جس کا مصحف ابی بکر حامل تھا وہ بھی بسلامت اور رسم الخط کی وحدت بھی قائم رہی۔ نیز ایک نسخہ حضرت عثمانؓ نے اپنے لیے مختص فرمایا جس کو الامام کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے جن کے پاس قرآن پاک کا اپنا نسخہ تھا سب کو طلب فرمایا اور دارالخلافت کا تیار کردہ ایک ایک نسخہ سات بڑے شہروں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، شام، یمن اور بحرین روانہ کیا۔ اور چونکہ صحابہ کے پاس دوسرے نسخے بھی موجود تھے اِن الصحابة كانت لهم صحف او مصاحف كتبوا فيها القرآن من قبل(۱۵) اس لیے یہ شاہی فرمان جاری کیا کہ اِس متفق علیہ (سرکاری) نسخہ ہی کو اختیار کیا جائے اور سابقہ تمام نسخے جو سرکاری نسخے کے خلاف ہوں نذر آتش کردیے جائیں(۱۶) قد استنخ عثمان بمدة نسخ من ذلك المصحف وارسلها الى الآفاق ليستفيد المسلمون منها ولايميلون الى ترتيب آخر (۱۷) صحابہ وتابعین نے خلیفۂ وقت کے فرمان کو سمعاً وطاعۃً قبول کیا اور اُن مصاحف کو جو مصحف عثمانی کے خلاف تھے باادب طریقہ سے ختم کردیا اور بغیر کسی اختلاف ونکیر کے مصاحف عثمانیہ پر مجتمع ومتحد ہوگئے، پس اختلافِ ضلالت کو جس کا خطرہ لاحق ہوا تھا بیخ وبن سے ختم کردیا گیا۔ یہ کارنامہ چونکہ حضرت عثمانؓ نے انجام دیا اس لیے قرآن کا یہ رسم الخط آپ کی طرف منسوب ہوکر رسم عثمانی کہلایا۔

حضرات صحابہ وتابعین کے اس غیر معمولی اجماع نے مصحف کی قرانیت کے لیے رسم عثمانی کو فرض وشرط بنادیا۔ علامہ جزری اپنی کتاب ”النشر“ میں لکھتے ہیں كل قرأة وافقت العربية لو بوجهٍ ووافقت احدَ المصاحف العثمانية ولو احتمالا وصح سندها فهى القرأة الصححة التى لايجوز ردها ولا يحل انكارها(۱۸) یعنی ہر وہ قراٴت جس میں یہ تین شرطیں پائی جائیں: (۱) قواعد نحویہ کی مطابقت، (۲) رسم الخط کی موافقت، (۳) اسناد صحیحہ متصلہ کی متابعت۔ تو وہ قراٴت صحیحہ ہے اس کا انکار کرنا جائز نہیں ہے۔ اور جس مصحف میں یہ تینوں ارکان موجود ہونگے وہی حقیقت میں قرآن کہلائے گا۔ صاحب خلاصۃ الرسوم لکھتے ہیں کہ ابوبکر احمد بن مہران اپنی کتاب الہجاء میں فرماتے ہیں: الحق والعدل والواجب والموجّه فى وفى خط المصحف ان يتبع كَتَبَةَ زيد بن ثابتؓ ورسم خطه وتصويره وتمثيله ولايحل للكاتب

مخالفته ولو كان حاذقاً فيهما(۱۹)۔

راقم الحروف نے ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں قرآن کے چوتھی صدی ہجری سے ۱۲/ویں صدی ہجری تک کے مخطوطہ بہت سے نسخے اجمالاً وتفصیلاً ملاحظہ کیے ہیں تو جو مصاحف رسم عثمانی کے موافق نہیں ہیں وہ الماریوں کی زینت ضرور ہیں لیکن منصۂ شہود پر یعنی امت محمدیہ کے سامنے قرآن مجید کا وہی نسخہ منقول ومتواتر چلا آرہا ہے جو رسم عثمانی کے مطابق ہے۔فللّٰہ در الخلیفہ۔

تنبیہ: اور جب رسم عثمانی کی اہمیت وفرضیت اور قبولیت کا یہ عالم ہے تو مادیات کی ترقی کے موجودہ زمانہ میں کمپیوٹر اور موبائل میں اتارے ہوئے قرآن کا باریک بینی سے مکمل جائزہ لینا ضروری ہے تا کہ رسم عثمانی کی موافقت ومخالفت کا حال منکشف ہوجائے۔راقم الحروف اس سلسلہ میں ایک تحقیقی اور تفصیلی تحریر ان شاء اللہ قارئین کی خدمت میں پیش کرے گا۔ كل شيء مرهون بوقته. وكل آتٍ قريبٌ.

دوسرے رسم الخط میں قرآن لکھنے کی ممانعت

امام اشہبؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ کوئی شخص قرآن لکھوانا چاہتا ہے تو کیا مصحف اُس خط میں لکھ سکتے ہیں جو لوگوں کے ایجاد کردہ ہیں امام مالکؒ نے فرمایا نہیں قرآن تو بس پہلے رسم الخط (رسم عثمانی) میں ہی لکھا جائے گا هل يكتب المصحف على ما احدثه الناس من الهجاء فقال لا الا على الكتبية الاولى(۲۰) امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانؓ کے خط (رسم الخط) کی مخالفت حرام ہے(۲۱) علامہ ابوعمرو الدانی فرماتے ہیں کہ علمائے امت میں سے کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے(۲۲) صاحب کشاف لکھتے ہیں وكان اتباع خط المصحف سنة لا تخالف(۲۳) مصحف عثمانی کے خط کا اتباع سنت (یعنی ایسا دستور) ہے جس کی مخالفت نہیں کی جاتی ہے۔جلال الدین سیوطیؒ امام بیہقی سے نقل کرتے ہیں من يكتب مصحفا فينبغى ان يحافظ على الهجاء الذى كتبوا به تلك المصاحف ولايخالفهم فيه ولا يغير مما كتبوه شيئاً فانهم كانوا اكثر علما واصدق قلبا ولسانا واعظم امانة فلا ينبغى ان نظن فانفسنا استدراكا عليهم(۲۴) یعنی جو شخص مصحف شریف لکھنا چاہتا ہے تو چاہیے کہ اس رسم الخط کی پابندی کرے جس سے صحابہ کرام نے مصاحف عثمانیہ لکھے ہیں ان کی مخالفت نہ کرے اور نہ ان کی لکھی ہوئی کسی چیز میں کوئی ادنیٰ تغیر کرے اس لیے کہ وہ حضرات پوری

امت میں سب سے علم والے اور قلب وزبان کے اعتبار سے سب سے سچے اور سب سے زیادہ امانت دار تھے پس خوش فہمی میں مبتلا ہوکر ان پر استدراک کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔

علامہ جعبری متوفی ۷۳۳ھ لکھتے ہیں رسم المصحف توقیفی هو مذهب الاربعة یعنی قرآن کریم کا یہ رسم الخط توقیفی اور سماعی ہے یہی ائمہ اربعہ کا مذہب ہے۔ (۲۵)

مولانا ظفر احمد تھانوی لکھتے ہیں: جب عربی ہی زبان میں مگر دوسرے رسم الخط میں قرآن کا لکھنا جائز نہیں ہے جبکہ اس میں وہ سارے حروف موجود ہیں جو خط عثمانی میں موجود ہیں تو پھر اس کے علاوہ دوسری زبان میں جس میں تمام حروف کو مکمل رعایت ہو ہی نہیں سکتی ہے لکھنا کب جائز ہوگا۔ (۲۶)

فقیہ الامت مفتیٔ اعظم ہند و دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ لکھتے ہیں .... عبارات منقولہ سے معلوم ہوا کہ مصحف عثمانی کے رسم خط کی رعایت ومتابعت لازم وضروری ہے اور اس کے خلاف لکھنا اگرچہ وہ عربی رسم خط میں ہی کیوں نہ ہونا جائز اور حرام ہے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے بلکہ علمائے امت میں سے کسی کا اختلاف نہیں تو یہ اجماعی مسئلہ ہوا پھر غیر عربی بنگلہ (ہندی، گجراتی) وغیرہ رسم خط میں لکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے اس میں تو جواز کا کوئی احتمال ہی نہیں بعض حروف عربی کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے طاء، حاء، ضاد، ظاء وغیرہ یہ حروف دوسری زبان میں استعمال ہی نہیں ہوتے ان کے لیے ان زبانوں میں نہ صوت ہے نہ شکل وصورت ہے تو لامحالہ ان کی جگہ دوسرے حروف لکھے جائیں گے اور یہ عملاً تحریف وتغییر ہے جو کہ حرام ہے۔ البتہ اگر متن قرآن کریم تو عربی اصل رسم خط میں ہو اور اس کا ترجمہ وتفسیر دوسری زبان میں تو شرعاً مضائقہ نہیں (۲۷)۔

تنبیہ: بہت سے علاقوں میں وہاں کے ہمدردانِ قوم مقامی عام لوگوں کی دینی راہنمائی کے لیے قرآن پاک کی چھوٹی سورتوں اور ماثور دعاؤں کو عربی خط میں لکھنے کے بجائے علاقائی زبان (ہندی، گجراتی، بنگالی وغیرہ) میں لکھ کر اور چھاپ کر شائع کرتے ہیں۔ مذکورہ تحریر سے معلوم ہوگیا کہ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

قراءتِ سبعہ یا عشرہ کا تواتر

پیغمبر ﷺ سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے والے ہزاروں میں سے پچاسوں صحابہ

تعلیم قرآن میں معروف تھے پھر ان میں سب سے زیادہ مشہور حضرت عثمانؓ، علیؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ تھے (۲۸) پھر تابعین کی ایک بڑی جماعت نے اُن سے اور دوسرے صحابہؓ سے قرآن کو اُن وجوہ سے حاصل کیا جن سے انھوں نے خود نبی امی ﷺ سے سیکھا تھا۔ پھر اُن میں متعدد شخصیتوں نے قرآن کریم پڑھنے اور پڑھانے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور یہی اُن کے شب وروز کا حقیقی موضوع اور بہترین مشغلہ تھا ثم تجرد قوم واعتنوا بضبط القرأة اتم عناية حتى صاروا ائمة يقتدى بهم ويرحل اليهم(۲۹) ثم تجرد قوم للقرأة والاخذ واعتنوا بضبطا اتم عناية حتى صاروا فيها ائمة يقتدى بهم واجمع اهل بلدهم على تلقى قرأتهم بالقبول(۳۰) یعنی بعض حضرات نے قرأتِ قرآن کی تعلیم وتبلیغ کے لیے اپنی زندگی کو وقف کردیا تھا اُن کی اِس قربانی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے علم قرأت میں انہیں امامت وپیشوائی کا رتبہ عطا فرمایا قال السيوطى: واشتهر من هؤلاء فى الآفاق الائمةُ ان میں سے پھر یہ لوگ یعنی امام نافع مدنی، امام ابن کثیر مکی، امام ابن عامر شامی، امام ابوعمرو بصری، امام عاصم کوفی، امام حمزہ کوفی، امام کسائی کوفی، کو عالم میں زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔(۳۱)

یہ ائمہ اگرچہ تمام متواتر قرأتوں کے حافظ وعالم تھے مگر ہر ایک کو ایک مخصوص قرأت میں جو ان کی پسندیدہ اور محبوب تھی امتیازی شان نصیب ہوئی یہاں تک کہ ہر قرأت ان اماموں میں سے ایک ایک کے نام کی طرف منسوب ہوگئی اور قرأت کا تواتر ان ائمہ کے ناموں سے وابستہ ہوگیا اور ان کی قرأت متواتر قرأت کی معرفت کا مدار بن گئی کہ دنیا کے کسی بھی گوشہ میں قرآن کی قرأت ہو وہ قرأت معتبر ومستند جب ہوگی جب کہ اس کی سند مذکورہ اماموں میں سے کسی ایک تک سند متصل سے پہنچتی ہے تو وہ متواتر کہلائے گی کیونکہ اِن ائمہ سے پیغمبر ﷺ تک قرآن کا تواتر یقینی ہے لہٰذا ہر امام کی قرأت کے قرآن ہونے کا یقین واجب اور ضروری ہے اور جو قرأت مذکورہ ائمہ سبعہ بلکہ عشرہ کے علاوہ کسی اور شخصیت کی طرف منسوب ہے وہ متواتر نہیں کہلائے گی۔

تنبیہ: قراء سبعہ وعشرہ کی قرأت کے متواتر ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قرأت کا تواتر اِن ائمہ قرأت سے شروع ہوا ہے اس سے قبل نہیں تھا۔ حاشا وکلاّ۔ اگر کسی کو یہ تردد ہوا ہو تو مذکورہ تحریر سے اس کا ازالہ ہوجاتا ہے۔ فافہم

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) اتقان،ص:۲۱۲نوع ۷۶۔
(۲) سورۂ یوسف پ۱۲۔
(۳) اتقان، ج:۲،ص:۲۱۲۔
(۴) الکامل للمبرد۔
(۵) مفتاح السعادۃ، ج۱،ص:۹۴۔
(۶) مناہل العرفان۔
(۷) مسلم شریف۔
(۸) مناہل، ج:۱،ص:۳۵۳۔
(۹) نثرالمرجان فی رسم نظم القرآن، ج:۱،ص:۱۰۔
(۱۰) اتقان۔
(۱۱) المقنع للدانی ص۴۔
(۱۲) مناہل، ج:۱،ص:۲۵۶
(۱۳) المقنع ،ص۴۔
(۱۴) مناہل، ج۱،ص۲۵۹۔
(۱۵) مناہل العرفان۔
(۱۶) ایضاً۔
(۱۷) الفوزالکبیر،ص۸۷۔
(۱۸) اتقان عن النشر ۔
(۱۹) نثرالمرجان، ج۱،ص:۱۱۔
(۲۰) المقنع ،ص۹۔
(۲۱) اتقان ص۲۱۳۔
(۲۲) المقنع ،ص۹۔
(۲۳) مفتاح السعادۃ، ج۱،ص:۹۴۔
(۲۴) اتقان عن البیہقی فی شعب الایمان۔
(۲۵) شرح العقیلہ ۔
(۲۶) امدادالفتاویٰ، ج۴،ص۴۴۔
(۲۷) فتاویٰ محمودیہ، ج۱،ص۴۶۔
(۲۸) الاتقان، ج۱،ص۹۶۔
(۲۹) ایضاً، ج۱،ص۹۷۔
(۳۰) نثرالمرجان، ج۱،ص۱۰۔
(۳۱) نثرالمرجان، منجد المقرئین،ص۲۳۔

بدیہیاتِ قرآن

حکمتیں اور فائدے

از: محمد عارف جمیل مبارک پوری
شارجہ، متحدہ عرب امارات

۱-فرمان باری ہے: تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض، منهم من كلم الله ورفع بعضهم درجات وآتينا عيسى ابن مريم البينات وأيدناه بروح القدس ولو شاء الله ما اقتتل الذين من بعدهم من بعد ما جاءتهم البينات ولكن اختلفوا فمنهم من آمن ومنهم من كفر ولو شاء الله ما اقتتلوا ولكن الله يفعل ما يريد [بقرہ/۲۵۳]

''یہ سب رسول، فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے، کوئی تو وہ ہے کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے، اور بلند کیے بعضوں کے درجے، اور دیے ہم نے عیسیٰ، مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبریل سے، اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ، جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے، بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف حکم، لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا، پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا، اور کوئی کافر ہوا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے''۔

اس آیت میں دو مقام پر بدیہیات ہیں:

مقام اول: (ورفع بعضهم درجات) کا مفہوم وہی ہے جو (تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض) کا ہے، پھر اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟ نیز (تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض) ایک کلامِ کلی ہے اس کے بعد (منهم من كلم الله) میں اسی جملہ کی تفصیلات کا آغاز ہے، اس کے بعد (ورفع بعضهم درجات) اسی کلی کا اعادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ جزئیات کی تفصیل کے آغاز کے بعد، کلام کا اعادہ، قابلِ اعتراض ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اول:(تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض رسولوں کی بعض پر فضیلت ثابت ہے؛ لیکن یہ فضیلت، کثیر درجات کے ساتھ ہے یا قلیل، اس کی اس میں وضاحت نہیں تھی جس کی توضیح (ورفع بعضهم درجات) میں کردی گئی جو ایک مستقل فائدہ ہے، لہٰذا یہ تکرار نہیں ہوا۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔

دوم: دونوں کا محمل الگ الگ ہے، لہٰذا تکرار نہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ابن عاشور لکھتے ہیں:

"(ورفع بعضهم درجات) میں یہ طے ہے کہ اس بعض سے مراد کوئی ایک متعین رسول ہیں، رسولوں کی ایک جماعت مراد نہیں۔ اور درجات سے مراد، فضیلت کے درجات ہیں، جو اس ایک کے لیے ثابت ہیں، اس لیے کہ اگر بعض سے مراد، اجمالی طور پر، رسولوں کی ایک جماعت ہو اور درجات سے مراد ان کے مابین درجات ہوں، تو (فضلنا بعضهم على بعض) کے ساتھ یہ کلام مکرر ہو جائے گا۔ نیز اگر یہی کہنا مقصود ہوتا کہ بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی گئی ہے، تو یوں کہہ دیتے: (ورفع بعضهم فوق بعض درجات) جیسا کہ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

ورفع بعضهم فوق بعض درجات [انعام/۱۶۵]

"اور بلند کیے تم میں درجے ایک کے ایک پر"

یہاں پر نام یا مشہور صفت کی تصریح نہ کرنے کی وجہ، مبلغ (یعنی رسول ﷺ) کی ذات سے حشمت کا ازالہ ہے۔ اور عرب والے، اپنی ذات کی تعبیر، "بعض" کے ذریعہ کرتے ہیں۔ لبید کا شعر ہے:

ترّاك أمكنة اذا لم أرضها أو يعتلق بعض النفوس حمامها

"میں ایسی جگہوں کو یک لخت خیر باد کہنے والا ہوں، جو مجھے پسند نہیں"

مراد اپنی ذات ہے۔

مخاطب کو بھی، "بعض" کے ذریعہ تعبیر کرتے ہیں، ابوطیب کا شعر ہے:

اذا كان بعض الناس سيفا لدولة ففى الناس بوقات لها وطبول

"اگر کچھ لوگ، کسی ملک کے لیے، تلوار کا کام کرتے ہیں تو کچھ لوگ بانسری اور طبلہ کا کام

کرتے ہیں“۔

اس طرح کے تمام مواقع پر، مراد کی تعیین قرینہ سے ہوتی ہے، مثلاً خبر یا صفت کا کسی ایک پر منطبق ہونا، جیسے طرفہ کا شعر ہے:

اذا القوم قالوا من فتی، خلت أننی عنیت فلم أکسل، ولم أتبلد

”جب قوم پکارتی ہے: کون ہے نوجوان؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ہی مقصود ہوں، پھر نہ میرے اندر کسل مندی آتی ہے، اور نہ بے وقوفی“

اسی اسلوب کے مطابق یہ آیت ہے:

وما أرسلناك علیهم وکیلا وربك أعلم بمن فی السموات والارض ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض [اسراء/۵۴،۵۵]

”اور تجھ کو نہیں بھیجا ہم، ان پر، ذمہ لینے والا“۔

اس سے پہلے یہ آیت ہے: واذا قرأت القرآن جعلنا بینك وبین الذین لا یومنون بالآخرة حجابا مستورا [اسراء/۵۴]

”اور جب پڑھتا ہے تو قرآن کردیتے ہیں ہم بیچ میں تیرے اور ان لوگوں کے، جو نہیں مانتے آخرت کو، ایک پردہ چھپا ہوا“۔

آگے فرمایا: وقل لعبادی یقول التی هی أحسن [اسراء/۵۳]

”اور کہہ دے میرے بندوں سے کہ بات وہی کہیں، جو بہتر ہو“۔

آگے فرمایا: ولقد فضلنا بعض النبیین علی بعض [اسراء/۵۵]

”اور ہم نے افضل کیا بعضے پیغمبروں کو بعضوں سے“۔

اس میں یہ خبر دینا ہے کہ اجمالی طور پر بعض پیغام بر، بعض سے افضل ہیں؛ لیکن افضل اور مفضول کی تعیین نہیں، اس لیے کہ ہر فریق، صفتِ خیر میں شریک ہے، اور اس مشترک صفت میں، کوئی ایک دوسرے کے بہ مقابل، صفت کمال میں اضافہ کی وجہ سے، افضل ہے۔ ان صفاتِ تفاضل میں تمیز میں، غموض اور خطا در آنے کا اندیشہ ہے، اور عقل انسانی جو غلطی اور غفلت کی زد میں ہیں، اس کے لیے یہ کام کوئی، آسان نہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ (جو سب کا پروردگار ہے اور اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی کو کسی سے افضل قرار دے) نے تفضیل کے بارے میں یہ خبر دے دی ہے، تو عام انسانوں کی یہ حیثیت نہیں کہ وہ رسولوں کے درجات کی تعیین کے درپے ہوں، ان کے لیے اسی حد پر رکنا کافی

ہے جس کی اطلاع، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یا اپنے رسول کی زبانی دی ہے۔(۲)

اسی قول کو زمخشری نے بھی ظاہر قرار دیا ہے، وہ رقم طراز ہیں:

"(ورفع بعضهم درجات) یعنی بعض نبی کا رتبہ، دوسرے تمام نبیوں پر بلند کیا ہے، چناں چہ وہ نبیوں میں فرقِ مراتب کے ساتھ، سب سے بہ درجہا افضل ہیں۔ بہ ظاہر اس سے مراد محمد ﷺ ہیں، اس لیے کہ انہی کو تمام نبیوں پر فوقیت دی گئی ہے کہ آپ ﷺ کو کثرت سے معجزات (جن کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے) دیے گئے، جو کسی اور نبی کو نہیں ملے، اور اگر صرف قرآن ہی ایک معجزہ ہوتا تو بھی، تمام نبیوں سے افضل ہونے کے لیے کافی تھا، کیوں کہ یہ ایسا معجزہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، دوسرے معجزات اس نوعیت کے نہیں۔

پھر اس ابہام میں اس فضیلت کی عظمت کو بیان کرنا ہے، اور آپ کے درجہ کو بلند کرنا ہے جیسا کہ مخفی نہیں، اس لیے کہ اس میں اس امر کی شہادت دینی ہے کہ یہ ایسی نمایاں شخصیت ہے جس کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوسکتا، وہ ایسی ممتاز ہستی ہے جس کے بارے میں کوئی التباس نہیں ہوسکتا۔ اور یہ محاورہ ہے کہ اگر پوچھا جائے کہ یہ کس نے کیا؟ تو جواب میں کہتے ہیں ایک (یا کسی) صاحب نے کیا ہے، جو اس طرح کے افعال سے معروف مشہور ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس اسلوب میں، صراحت سے زیادہ تعظیم ہے۔ حطیئہ سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے زہیر اور نابغہ کا نام لیا اور کہا کہ اگر چاہوں تو تیسرے کا ذکر کردوں۔ اس موقع پر اگر وہ یوں کہہ دیتا کہ اگر چاہوں تو اپنا نام لے لوں تو اس کے اندر وہ تعظیم نہ ہوتی۔"(۳)

یہ جواب آلوسی نے بھی نقل کیا ہے۔(۴)

سوم: ابن عطیہ کہتے ہیں: "یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد، محمد ﷺ اور دوسرے وہ انبیاء کرام ہوں، جن کو عظیم معجزات دیے گئے، اور یہ جملہ، ماسبق کی تاکید کے لیے لایا گیا ہو"۔

یہ جواب زمخشری اور آلوسی نے بھی نقل کیا ہے۔(۵)

مقامِ دوم: فرمان باری (ولو شاء الله ما اقتتلوا) کے تکرار میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اول: واحدی کہتے ہیں: تکرار کا مقصد، کلام کی تاکید اور ان لوگوں کی تکذیب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام اپنے طور پر کیا ہے، اللہ کی طرف سے قضا و قدر کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ جواب زمخشری، رازی، ابن عاشور اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۶)

یہ جواب آلوسی نے بھی لکھا ہے اور تاکید کا فائدہ بیان کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''اکثر کی رائے ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے؛ لیکن اس کے پیچھے ایک خاص راز ہے (جیسا کہ صاحب ''الانتصاف'' نے لکھا ہے) وہ یہ کہ جب عرب والے، اپنی گفتگو کا ابتدائی حصہ کسی مقصد پر قائم کرتے ہیں پھر سلسلہ کلام میں کوئی اور مقصد آجاتا ہے، اس کے بعد پہلے مقصد کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تو اس کا ذکر یا تو اسی عبارت میں کرتے ہیں یا اس سے ملتی جلتی عبارت میں۔ یہ عربوں کے یہاں فصاحت کا ایک رائج اسلوب اور عام انداز ہے۔ قرآن کریم میں بھی اس کی کئی مثالیں ہیں، جیسے فرمان باری:

من کفر باللّٰہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان؛ لکن من شرح بالکفر صدرا. [نحل/۱۰۶]

''جوکوئی منکر ہوا اللہ کا، یقین لانے کے پیچھے، مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل، ایمان پر برقرار ہے؛ لیکن جو کوئی دل کھول کر منکر ہو''۔

زیرِ بحث آیت بھی اسی انداز کی ہے کہ ابتدا میں یہ بیان فرمایا کہ ان کی آپسی لڑائی، مشیئت الٰہی سے ہوئی، پھر سلسلہ کلام دراز ہوگیا اور اس کے بعد یہ بیان فرمانا چاہا کہ اللہ کی مشیئت، جس طرح اس خاص امر (یعنی ان کی آپسی لڑائی) میں نافذ ہے، اسی طرح ہر وجود میں آنے والے فعل میں نافذ ہے۔ اور اسی کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

ولکن اللّٰہ یفعل ما یرید.

''لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے''۔

اس میں لڑائی کے ساتھ مشیئت کے تعلق کا ذکر آگیا تاکہ اس کے بعد مشیئت کے عمومی تعلق کا ذکر آئے۔ تاکہ کلام میں مناسبت پیدا ہوجائے اور ہر ایک اپنی نظیر اور مثل کے ساتھ منسلک ہوجائے۔ یہ ایسا سربستہ راز ہے جس کے بیان سے دل کو انشراح ہوتا ہے، اور باطن کو سکون ملتا ہے۔ اور شاید یہ جواب اس سے بہتر ہے کہ کہا جائے کہ اول الذکر میں بلاواسطہ اور موخرالذکر میں بہ واسطہ، مومنین ہے۔ یا اس کے برعکس کہا جائے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حوادث (خیر ہوں یا شر، ایمان ہو یا کفر) اللہ کی مشیئت کے تابع ہیں''۔ (۷)

دوم: یہاں پر تاکید نہیں؛ اس لیے کہ دونوں مشیئتیں الگ الگ ہیں: اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کو لڑنے سے روک دیتا بایں طور پر کہ ان کے قوی اور عقلوں کو سلب

کردیتا۔ اور دوم سے مراد یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو مسلمانوں کولڑنے کا حکم دے دیتا؛ لیکن اس کا حکم اور مشیئت یہی تھی کہ وہ آپس میں لڑیں۔

اس آیت سے تقدیر ماننے اور نہ ماننے والے دونوں نے استدلال کیا ہے۔ حتی کہ دورِ جاہلیت میں اعشی شاعر تقدیر کا منکر تھا وہ کہتا ہے

استأثر بالوفاء والعد ل وولی الملامة الرجلا

اللہ نے وفاء اور عدل اپنے پاس رکھا؛ لیکن ملامت آدمی کے سر کردی۔

لبید شاعر تقدیر کو مانتا تھا، وہ کہتا ہے

من هداه سبل الخير اهتدى ناعم البال ومن شاء اضل

”جس کو اللہ نے خیر کے راستے دکھائے اسے آسانی سے ہدایت مل گئی اور جسے چاہا گمراہ کردیا“۔

یہ جواب ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۸)

ان میں تکرار نہیں، اسی کی طرف، ابوسعود کا بھی رجحان ہے، آلوسی لکھتے ہیں:

”اس درجہ اختلاف (جس کے بعد عادتاً لڑائی ہوجاتی ہے) کے باوجود، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو (مااقتتلوا) وہ لڑائی نہ کرتے، نہ ایک دوسرے پر ظلم وستم کے لیے سر اٹھاتے؛ اس لیے کہ سب اللہ کے دست قہر میں ہے۔ لہٰذا یہ تکرار تاکید کے لیے نہیں جیسا کہ بعض حضرات نے سمجھا ہے؛ بلکہ اس امر پر تنبیہ ہے کہ ان کا اختلاف، ان کے نہ لڑنے کے بارے میں اللہ کی عدم مشیئت کا موجب نہیں، جیسا کہ استدرا کی جملہ کی جگہ میں رکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ مختارِ کل ہے حتی کہ اگر اس کے باوجود چاہتا کہ وہ نہ لڑیں، تو نہ لڑتے، جس کی وضاحت یہ استدرا کی جملہ کررہا ہے (ولكن الله يفعل ما يريد) جیسا چاہے وہی ہوگا، اس پر کوئی کسی چیز کو واجب کرنے والا نہیں، اور نہ اس کو کوئی کسی چیز سے روکنے والا ہے۔ یہ ابوسعود قدس سرہ نے تحقیق کی ہے۔ اور یہ نہایت عمدہ ہے۔ البتہ اس پر، علامہ عبدالباقی بغدادی نے اپنی ”تفسیر“ میں تقریباً وہی اعتراض کیا ہے، جو اس قیاس کی نظیر میں اوپر گذرا۔ اور یہ لکھا ہے کہ یہ ارباب عربیت اور ارباب استعمال کے یہاں (لو) کے استعمال کے خلاف ہے۔ اور اس کا بھی معمولی تبدیلی کے ساتھ وہی جواب دیا

جاسکتا ہے، جواوپر گذرا۔جس کوفراموش نہیں کرنا چاہیے۔تکرار کی یہ توجیہ ہمارے علم کے مطابق موصوف کے علاوہ کسی نے نہیں کی۔'' (۹)

۲- فرمان باری: یا أیھا الذین آمنوا أنفقوا مما رزقناکم [بقرہ/۲۵۴]

''اے ایمان والو! خرچ کرواس میں سے جوہم نے تم کوروزی دی''۔

بدیہی بات ہے کہ رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوتا ہے پھراس کی صراحت کرنے میں کیافائدہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے کا ذکر کرنے میں، خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔جیسا کہ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

وأنفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه [حدید/۷]

''اورخرچ کرواس میں سے جوتمہارے ہاتھ میں دیااپنانائب کرکے''

یہ جواب ابن عاشور، ابوسعوداورآلوسی نے نقل کیا ہے۔(۱۰)

۳- فرمان باری: لا تأخذہ سنة ولا نوم [بقرہ/۲۵۵]

''نہیں پکڑسکتی اس کواونگھ نہ نیند''

اونگھ، نیند کا ابتدائی حصہ ہے، اس لیے جب یہ کہا (لا تأخذہ سنة) تو نیند کا نہ آنا بدرجہ اولیٰ ہے، اب اس کے بعد یہ کہنا (ولا نوم) تکرار معلوم ہوتا ہے؟

اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں:

اول: آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کواونگھ نہیں لگتی چہ جائے کہ نیند آئے۔ یہ جواب رازی نے دیا۔(۱۱)

دوم: ابن عاشور کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی ذات سے اونگھ آنے کی نفی کردینا، نیند کی نفی کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس لیے کہ بعض جان دار ایسے ہیں جن کواونگھ نہیں آتی؛ بلکہ جب وہ سوتے ہیں تو گہری نیند میں سوتے ہیں۔اور کچھ لوگوں کو نیند کے وقت کے علاوہ، بے ساختہ اونگھ آجاتی ہے۔عربوں میں بے خوابی کی قدرت ایک قابل تعریف خصلت تھی۔ایک شاعرابوکبیر ہذلی کہتا ہے

فأتت به حوش الفواد مبطنا سھدا اذا ما نام لیل الھوجل

''اس کی ماں نے اس کوتیز دل ودماغ والا جنا ہے، اس کا پیٹ پشت سے لگا ہے، کم سونے

والا ہے جب کہ حد درجہ بے وقوف رات بھر سوتا رہتا ہے“

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے لیے کوئی حجاب نہیں، نہ کم زور، نہ طویل، نہ جبری نہ کسبی۔

ابن عاشور نے پہلے قول کی تردید کرتے ہوئے کہا:

”لہٰذا فخر الدین رازی اور بیضاوی کی اس تحقیق کی ضرورت نہیں رہتی کہ ”نیند“ سے پہلے ”اونگھ“ ذکر کرنے میں اس امر کی رعایت ہے کہ وجود کے لحاظ سے ان میں یہی ترتیب ہے۔ اور نیند کا ذکر از قبیل احتراس ہے۔ اسی مفہوم کو بشار شاعر نے اخذ کرتے ہوئے شعر کے انداز میں اس طرح ڈھالا ہے، وہ کہتا ہے

ولیل دجوجی تنام بناته   وأبنائوه من طوله و ربائبه

”اور کتنی گھٹا ٹوپ راتوں کو جس میں، پابندی کے ساتھ رات جاگنے والے اور جاگنے والیاں اوران سے کم درجہ میں رات جاگنے والے اس کی طوالت کی وجہ سو چکے ہوتے ہیں“۔

یہاں ”بنات اللیل اور ابنائوه“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو شب بے داری کے رسیا ہیں اور ”ربائبه“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو شب بے داری میں ان سے کم ہیں؛ اس لیے کہ حقیقی بیٹے اور بیٹی کے مقابلہ میں، پروردہ کا انتساب کم زور ہوتا ہے۔ (۱۲)

۴- فرمان باری:

یا أیها الذین آمنوا أنفقوا من طیبات ما کسبتم ومما أخرجنالکم من الأرض ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم بآخذیه الا أن تغمضوا فیه واعلموا أن اللّٰه غنی حمید. [بقرہ/۲۶۷]

”اے ایمان والو! خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے، اور اس چیز میں سے کہ ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے، اور قصد نہ کرو گندی چیز کا کہ اس کو خرچ کرو، حالاں کہ تم اس کو کبھی نہ لوگے، مگر یہ چشم پوشی کر جاؤ، اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہ ہے، خوبیوں والا“۔

یہ بدیہی بات ہے کہ جب پاکیزہ چیز خرچ کرنے کا حکم ہے تو بری چیز خرچ نہ کی جائے اس کا علم ہو گیا پھر اس کو دوبارہ ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

ابوحیان اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس میں پہلے حکم کی تاکید ہے؛ اس لیے کہ یہ مفہوم (أنفقوا من طیبات ما کسبتم) سے سمجھ میں آچکا تھا۔ اس میں عربی فصاحت وبلاغت کا ایک اسلوب (طیبات اور خبیث) میں

طباق ہے“۔(۱۳)

۵- فرمان باری:

ان تبدو الصدقات فنعما هی وان تخفوها وتوتوها الفقراء فهو خیرلکم ویکفر عنکم من سیئاتکم واللّٰه بما تعملون خبیر [بقرہ/۲۷۱]

”اگر ظاہر کرکے دو خیرات تو کیا اچھی بات ہے، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے حق میں، اور دور کرے گا کچھ گناہ تمہارے، اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے“۔

بدیہی بات ہے کہ صدقہ، فقراء ہی کے لیے ہوتا ہے۔ اور جو صدقہ کھلے طور پر دیا جائے وہ بھی فقیروں ہی کو ملے گا۔ پھر خفیہ طور پر جو صدقہ دیا جائے اس میں یہ قید لگانے کی کیا ضرورت ہے کہ اسے فقراء کو پہنچاؤ؟

مفسرین نے اس کے کئی جواب دیے ہیں:

اول: شاید اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو خیرات کھلے طور پر دی جاتی ہے وہ فقیروں کو ہی دی جاتی ہے، اس لیے کہ اس میں فقیر اور غیر فقیر کا امتیاز ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ حالات سے آدمی کو اندازہ لگ جاتا ہے، اس کے برخلاف چھپا کر جو صدقہ دیا جاتا ہے اس میں یہ شرط لگادی کہ فقیروں کو دیا جائے، اس میں جس کو خیرات دی جائے اس کے حالات کی تفتیش پر آمادہ کرنا ہے۔ اس لیے کہ حریص نگاہ والے (جو فقیر نہیں ہوتے) کھلے طور پر جو خیرات دی جائے اس کو لینے کے لیے سامنے آنے سے شرماتے ہیں؛ لیکن جو خیرات چھپا کر دی جائے اس کو لینے کے لیے سامنے آنے سے نہیں شرماتے۔ یہ جواب ابن عاشور نے نقل کیا ہے اور اسے عصام الدین سے منسوب کیا ہے۔ یہ جواب رازی، ابوحیان، ابوسعود اور آلوسی نے بھی نقل کیا ہے۔(۱۴)

دوم: خفاجی کہتے ہیں کہ ظاہری خیرات میں فقراء کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اس سے مراد زکاۃ ہے اور اس کے مصارف فقراء اور دوسرے مستحقین بھی ہیں۔ جب کہ خفیہ خیرات سے مراد نفلی صدقات ہیں اور اس کے مصارف صرف فقراء ہیں۔

ابن عاشور نے یہ قول نقل کرنے کے بعد کہا کہ دو وجوہات سے یہ ناقابل قبول ہے:

اول: ظاہری صدقہ کو، فرض صدقہ میں منحصر کرنا بلاوجہ ہے، اور اس کا کوئی قائل بھی نہیں ہے، ہاں اس میں اختلاف ہے کہ خفیہ صدقہ کرنے کی فضیلت، فرض صدقہ کو بھی عام ہے یا نہیں؟

ہمارے جدامجد ابن عاشور خفیہ صدقہ کی جو حدیث صحیح مسلم میں آئی ہے اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ

''آیت میں خفیہ صدقہ دینے پر، فقیروں کو دینے کا عطف کیا گیا ہے، جس کو افضل ہونے کی شرط قرار دیا گیا ہے حالاں کہ یہ معلوم ہے کہ صدقہ فقیروں کے لیے ہی ہوتا ہے، اس میں افضلیت کی وجہ یہ بتانا ہے کہ فقیر کے حالات کو مخفی رکھا جائے، اور دینے والے ہاتھ کی برتری کا اظہار نہ ہو''۔

یعنی اس میں علت کی طرف اشارہ ہے اور وہ فقیر کی آب رو کو قائم رکھنا ہے۔ اور یہی قول فیصل ہے تاکہ ریاء کا کوئی شائب ہی نہ رہے۔(۱۵)

اس دوسرے قول کو آلوسی نے بھی رد کیا ہے وہ رقم طراز ہیں:

''یہ قول ہیچ ہے، اس لیے کہ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ علانیہ صدقہ سے مراد زکاۃ اور خفیہ سے مراد نفلی صدقہ ہے۔ تو ہم یہ نہیں مانتے کہ نفلی صدقہ کے مصارف صرف فقراء ہیں، اور اس کو ثابت کرنے کے لیے جان دینی ہوگی۔ اور اسی وجہ سے بعض حضرات نے فقراء سے مصارف مراد لیے ہیں۔(۱۶)

۶- فرمان باری: وما تنفقوا من خیر فان اللّٰہ به علیم [۲۷۳]

''اور جو کچھ کام کی چیز خرچ کروگے وہ بے شک اللہ کو معلوم ہے''۔

یہاں پر خرچ کرنے کا ذکر تین بار آیا ہے، تو اس تکرار میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اول: امام رازی کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے فقراء کے اوصاف بیان فرمانے کے بعد فرمایا (وما تنفقوا من خیر فان اللّٰہ به علیم[۲۷۳]) اس جیسا مضمون اس سے پہلے والی آیت میں آچکا ہے، فرمان باری ہے وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون [بقرہ/۲۷۲]

''اور جو کچھ خرچ کروگے خیرات سو پوری ملے گی تم کو، اور تمہارا حق نہ رہے گا۔''

یہ از قبیل تکرار نہیں؛ بلکہ اس کی دو وجوہات ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا (وما تنفقوا من خیر فان اللّٰہ به علیم[۲۷۳]) تو یہ بات بدیہی طور پر معلوم تھی کہ بلاکم وکاست پورا پورا اجر وثواب دینے کے لیے یہ معلوم ہونا ضروری

ہے کہ عمل کس قدر ہے، اور اجر وثواب کے استحقاق کے لیے اس کی جہات کیا ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو اس آیت میں بیان فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کو اعمال کی مقدار اور کیفیات کا علم ہے۔

۲- اللہ تعالیٰ نے جب مسلمان اور ذمی (غیر مسلم رعایا) ہر ایک کے لیے خیرات کی ترغیب دی اور فرمایا:

وما تنفقوا من خير يوف اليكم [بقرہ/۲۷۲]

''اور جو کچھ خرچ کروگے خیرات سو پوری ملے گی تم کو''۔

تو یہ بیان فرمادیا کہ اس کا اجر لامحالہ ملنے والا ہے۔ پھر اس آیت میں مذکورہ اوصاف کے حامل فقراء پر خیرات کی ترغیب دی اور یہ خرچ کرنے کا بہترین موقع تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے عظیم ثواب کو بھی بیان کردیا اور فرمایا وما تنفقوا من خير فان الله به عليم[۲۷۳]

''اور جو کچھ کام کی چیز خرچ کروگے وہ بے شک اللہ کو معلوم ہے۔''

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ بادشاہ کسی سے کہے کہ تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ اپنی حسن اطاعت اور بہترین خدمت پر گواہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کی وقعت اس سے زیادہ ہے کہ وہ یوں کہے کہ تم کو تمہارا بدلہ ملے گا۔(۱۷)

ابوحیان نے بھی یہ سوال اٹھایا اور اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

"(وما تنفقوا من خير فان الله به عليم) سے پہلے (وما تنفقوا من خير فلأنفسكم) اور (وما تنفقوا من خير يوف اليكم) یہ دونوں آیتیں آچکی ہیں، اور ان میں تکرار وتاکید نہیں؛ بلکہ ہر ایک کے ساتھ الگ الگ قیدیں ہیں۔ چناں چہ پہلی آیت میں یہ بیان فرمایا کہ انسان جو نیکی (جس کو اس کے علاوہ بھی جانتا ہے) کرتا ہے وہ اس کے اپنے لیے ہے، اور اس کا بدلہ اس کو ملے گا۔

دوسری آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اس نیکی سے ملنے والا ثواب، اسے بلاکم وکاست مکمل ملے گا۔

تیسری آیت میں یہ بیان فرمایا کہ انسان جو بھی نیکی کرتا ہے اس کی مقدار، اور ثواب کے مرتب ہونے کی اثر انگیز صورتیں اللہ کے علم میں ہیں، اس لیے یہاں پر ایسے وصف (یعنی علم) کا ذکر کیا جو اطلاع معلوم ہوتی ہے۔(۱۸)

۷- فرمان باری: الذين ينفقون أموالهم بالليل والنهار سرا وعلانية [بقرہ/۲۷۴]

''جولوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کواور دن کو، چھپا کراور ظاہر میں''۔
سوال یہ ہے کہ خرچ کرنا، دن یا رات اور خفیہ یا علانیہ ہی ہوتا ہے پھراس کوذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

زمخشری اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مراد یہ ہے کہ یہ لوگ نیکی کمانے کے حریص ہیں، اس لیے ہر وقت اور ہر حالت میں خرچ کرتے ہیں، جب بھی کوئی حاجت مند آتا ہے تو اس کی حاجت کشائی کر دیتے ہیں ٹال مٹول نہیں کرتے اور نہ کسی حالت یا وقت کا بہانا کرتے ہیں۔'' (۱۹)

۸- فرمان باری:

یا أیھا الذین آمنوا اذا تداینتم بدین الی أجل مسمی فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل ولا یأب کاتب أن یکتب کما علمه اللّٰہ فلیکتب ولیملل الذی علیه الحق ولیتق اللّٰہ ربه ولا یبخس منه شیئا فان کان الذی علیه الحق سفیھا او ضعیفا أو لا یستطیع أن یمل فلیملل ولیه بالعدل [بقرہ/۲۸۲]

''اے ایمان والو! جب تم معاملہ کرو آپس میں ادھار کا، کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو، اور چاہیے کہ لکھ دے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے، اور انکار نہ کرے لکھنے والا، اس سے کہ لکھ دے جیسا کہ سکھایا اس کو اللہ نے، سو اس کو چاہیے کہ لکھ دے، اور بتاتا جائے وہ شخص کہ جس پر قرض ہے، اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے، اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ، پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے، یا آپ نہیں بتا سکتا تو بتادے کارگذار اس کا انصاف سے''۔

اس آیت میں چند مقامات پر بدیہیات ہیں:

مقام اوّل: (تداینتم) کے لفظ سے، (دین) ہونا سمجھ میں آرہا تھا پھر اس کو الگ سے صراحتاً بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟

مفسرین نے اس کے کئی فائدے بیان کیے ہیں:

۱- اس میں ایک لفظ مشترک معنی کی تعیین اور تخصیص، اور صراحتاً دوسرے معنی کے وہم کو ختم کرنا ہے۔ اس لیے کہ (تداینتم) کے دو معنی آتے ہیں: (۱) تعاملتم بدین یعنی ادھار معاملہ کرنا۔ (۲) تجازیتم بدین یعنی بدلہ دینا۔ یہاں یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے کہ اس وہم کو ختم

کرنے کے لیے، سیاق ہی کافی تھا اس لیے کہ گفتگو اس میں ہے کہ بہ صراحت بیان کیا گیا یا نہیں، پھر یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ہشیار آدمی ہی سیاق پر متنبہ ہوتا ہے۔ یہ فائدہ رازی، ابوحیان، ابوسعود اور آلوسی نے بیان کیا ہے۔(۲۰)

علامہ طیبی نے بہ حوالہ ''صاحب الفرائد'' لکھا ہے کہ یہاں یہ خیال پیدا ہونے کا امکان تھا کہ (تداینتم) مجازاً ''وعدہ'' کے معنی میں استعمال ہو۔ جیسا کہ روبہ شاعر کا شعر ہے

داینت اروی والدیون تقضی فمطلت بعضا و ادت بعضا

''میں نے (اپنی معشوقہ) ''اروی'' سے ایک ادھار کا معاملہ (وعدہ) کیا تھا، اور قرضے ادا کیے جاتے ہیں، لیکن اس نے کچھ تو ادا کیے اور کچھ نہیں۔

وعدتنا بدرهمینا طلاء وشواء معجلا غیر دین

''اس نے ہمارے درہموں کے بدلہ، ہم سے، طلاء (ایک قسم کی شراب) اور بھنے گوشت کا وعدہ کیا جو فی الفور ادا کرنا تھا ادھار نہیں تھا''۔(۲۱)

۲- (بدین) کا ذکر اس لیے کیا تا کہ (فاکتبوہ) کی ضمیر اس کی طرف لوٹ سکے اور یہ کہنا ہوتا (فاکتبوا الدین) اور اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں اس صورت میں کلام میں وہ حسن پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ (تداینتم) کا لفظ (دین) پر دلالت کر رہا تھا اس لیے اس کی طرف ضمیر لوٹنے میں کوئی اشکال نہیں تھا جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے:

اعدلوا هو اقرب للتقوی [مائدہ/۸]

''عدل کرو یہی بات زیادہ قریب ہے تقوی سے''۔

اس کا جواب یہ ہے کہ (دین) سے مراد مصدر نہیں، بلکہ دو میں سے ایک عوض ہے، اور ظاہر ہے کہ سیاق سے صرفِ نظر، لفظ (تداینتم) اس پر، قطعاً دلالت نہیں کرتا، اور بیان و وضاحت کے مقام میں اس پر اکتفا نہیں کیا جاتا خصوصا جب کہ التباس کا اندیشہ ہے۔ یہ جواب رازی، ابوحیان، ابن عاشور، ابوسعود اور آلوسی نے دیا ہے۔(۲۲)

۳- اس کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں، دین کی ''موجل'' اور ''حال'' (واجب الادا) دو قسموں کی وضاحت زیادہ ہے؛ اس لیے کہ نکرہ میں شیوع اور تبعیض ہوتی ہے، کیوں کہ اس کو غایت کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے۔ اگر اس کو ذکر نہ کرتے تو یہ احتمال باقی رہتا کہ دین صرف موجل ہی ہوتا ہے۔ یہ جواب زمخشری، ابن عاشور، ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔(۲۳)

۴- یہ صرف اطناب کے لیے ہے۔ جیسے: رأيته بعيني (میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا)، لمسته بيدي (میں نے اپنے ہاتھوں سے چھوا) یہ جواب ابوحیان اور ابن عاشور نے دیا ہے۔(۲۴)

۵- یہ تاکید کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فسجد الملائكة كلهم أجمعون [حجر/۳۰]

''تب سجدہ کیا ان فرشتوں نے، سب نے مل کر''۔

اور فرمان باری: ولا طائر يطير بجناحيه [انعام/۳۸]

''اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا ہے اپنے دو بازووں سے''۔

یہ جواب رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۲۵)

۶- مراد یہ ہے کہ جب تم کسی طرح کے دین کا معاملہ کرو، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی نوعیت کا ہو: میعادی قرض یا سلم یا کسی چیز کی فروخت۔ یہ جواب رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۲۶)

۷- امام رازی کہتے ہیں:

''میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ ''مداینۃ'' میں مفاعلت (جانبین سے شرکت ہوتی) ہے۔ اور اس کی صورت یہی ہوگی کہ دین کو دین کے عوض فروخت کیا جائے، اور یہ باطل ہے۔ لہٰذا اگر صرف یہ کہتے (اذا تداينتم) تو اس نص کا حکم دین کے عوض دین کی خرید وفروخت میں منحصر ہوتا اور یہ باطل ہے، لیکن جب اس کے بعد (بدين) کہہ دیا تو اس کا معنی یہ ہوا کہ جب تم اس طرح کا مداینت کرو جس میں ایک دین ہو۔ اب دین کے عوض ''دین'' کی فروخت اس آیت سے خارج ہوگئی۔ اور ''عین'' کو ''دین'' کے عوض فروخت کرنے اور ''دین'' کو ''عین'' کے عوض فروخت کرنے کی شکل باقی رہ گئی۔ اس لیے کہ بہ ہر دو صورت ایک ہی ''دین'' ہوتا ہے دو نہیں۔''(۲۷)

مقام دوم: مدانیت میں میعاد ہونا لازم ہے پھر (الى اجل) کے ذریعہ اس کو ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آگے اس کی صفت (مسمى) آرہی ہے اسی کی رعایت میں اس کو ذکر کردیا۔ اور اس صفت کا فائدہ یہ احاطۂ علم میں لانا ہے کہ یہ میعاد، معلوم ومعین ہونی چاہیے مثلاً سال، ماہ اور ایام کی تعیین ہو۔ لہٰذا اگر یہ کہا کہ کھیتی کی کٹائی تک یا اس کی گہائی تک یا حاجی کے آنے تک کے لیے ادھار ہے۔ تو یہ درست نہیں اس لیے کہ تعیین نہیں۔ یہ فائدہ رازی، ابوحیان، ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔(۲۸)

مقام سوم: لفظ (فليكتب) سے، محرر سمجھ میں آگیا تھا پھر اس کو صراحت کے ساتھ (كاتب) کہنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

۱- اولاً اجمالی طور پر تحریر کر لینے کا حکم دیا گیا ہے اس کے بعد (وليكتب بينكم كاتب بالعدل) میں اس تحریر کی کیفیت اور اس کو انجام دینے والے کی تعیین کی گئی ہے۔ یہ جواب ابوسعود اور ان کے بعد آلوسی نے لکھا ہے۔(۲۹)

۲- یہ تاکید کے لیے ہے۔ یہ جواب ابوحیان نے دیا ہے۔(۳۰)

مقام چہارم: سوال یہ ہے کہ جب لکھنے کا حکم آگیا تو اس سے لکھنے سے گریز کرنے کی ممانعت سمجھ میں آگئی تھی، پھر اس کو دوبارہ بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

۱- یہ تاکید کے لیے ہے۔ یہ جواب ابوسعود اور آلوسی نے دیا ہے۔ لیکن یہ جواب اس صورت میں ہے جب کہ (كما علمه الله) کا تعلق (يكتب) سے ہو۔ یعنی اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کرم فرما کر اس کو دستاویز نویسی کا فن عطا کیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: أحسن كما أحسن الله اليك (اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تو تم بھی حسن سلوک کرو) مطلب یہ کہ دستاویز نویسی کے، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے گریز نہ کرے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کرم فرما اور اس کو یہ امتیازی مقام عطا فرمایا۔ اور اس کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ کسی چیز سے ممانعت، اصح قول کے مطابق، صراحتاً اس کی ضد کا حکم دینا نہیں۔ لہٰذا تحریر کی اہمیت بتانے کے لیے اس کو صراحتاً ذکر فرما کر اس کی تاکید کر دی۔ اور یہیں سے بعض حضرات نے یہ بات اخذ کی ہے کہ امر وجوب کے لیے اور فرض کفایہ ہے۔ لیکن چوں کہ یہ امر ہمارے فائدہ کے لیے تھا ہمارے خلاف نہیں، اس لیے اس کو وجوب سے ہٹا دیا گیا مبادا جہالت اجل والے مسئلہ میں جو اشکال تھا وہی یہاں بھی نہ لوٹ آئے۔

زمخشری، رازی ابوحیان اور ابن عاشور بھی تاکید ہی کی بات لکھتے ہیں، ابن عاشور رقم طراز ہیں:

”(فليكتب) یہ (ولا ياب كاتب) کی تفریع ہے، جس میں مقتضٰی کو بہ صراحت بیان کرنا اور (فاكتبوه) میں امر کو مکرر ذکر کرنا ہے۔ لہٰذا یہ امر و نہی دونوں کی تاکید ہے، اس کو دوبارہ اس لیے لایا گیا تاکہ (وليملل الذى عليه الحق) کو اس پر مرتب کیا جا سکے، اس لیے کہ اس سے

متصل امر اوّل دور ہوگیا تھا۔اس کی نظیر سورہ اعراف کی یہ آیت ہے۔

واتخذ قوم موسی من بعده من حليهم عجلا جسدا [اعراف/۱۴۸]

”اور بنالیا موسی کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور سے بچھڑا“۔

کہ اس کے بعد فرمایا: اتخذوه [اعراف/۱۴۸]

”معبود بنالیا اس کو“۔

۲-دوم اس میں تکرار نہیں۔اس لیے کہ امر کا تعلق جس سے ہے، نہی کا تعلق اس سے نہیں۔ یہ جواب اس صورت میں ہے جب کہ (كما علمه) میں کاف کا تعلق (فليكتب) سے ہو۔اور فاء اس سے مانع نہیں جیسا کہ فرمان باری میں ہے:

وربك فكبر [مدثر/۳]

”اور اپنے کپڑے پاک رکھ“۔

اس لیے کہ معنوی لحاظ سے یہ ”صلہ“ ہے۔ یہ تاکید نہیں؛ بلکہ یہاں پر یہ کہ اولاً مطلق تحریر سے گریز کرنے کی ممانعت کی گئی، پھر تحریر مقید کا حکم دیا گیا، اور اس صورت میں تاکید نہیں؛ اس لیے کہ مطلق سے گریز کی ممانعت، مقید کے مامور بہ ہونے کی دلیل نہیں، ورنہ پھر اس کا اس کے بعد ذکر تاکید ہوتی، جیسا کہ بعض حضرات نے اس کا دعویٰ کیا ہے،اس لیے کہ اگر مطلق کتابت سے گریز ممنوع ہے تو کتابت شرعیہ سے گریز کرنا بہ درجہ اولیٰ ممنوع ہوگا۔اور کتابت شرعیہ سے گریز کی ممانعت، کتابت شرعیہ کا امر و حکم ہے۔لہٰذا کتابت شرعیہ کا حکم دینا صراحتاً تاکید ہوگی۔مزید براں یہ کہ اگر مطلق ومقید دونوں آئیں اور واقعہ ایک ہو، تو مطلق کو مقید پر محمول کریں گے، خواہ مطلق پہلے آئے یا بعد میں۔تو جس طرح پہلی صورت میں، مطلق کتابت کو، کتابت مقیدہ پر محمول کیا گیا ہے، تاکہ تاکید کا فائدہ دے، تو مطلق کتابت سے گریز کی ممانعت کو، تاکید کے لیے، کتابت مقیدہ پر محمول کیوں نہ کیا جائے، اور ان دونوں میں تفریق کرنا محض تحکم ہے۔ یہ جواب زمخشری، ابوحیان، ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔(۳۱)

۸-فرمان باری: لها ما كسبت، وعليها ما اكتسبت [بقرہ/۲۸۶]

”اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا، اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا“۔

یہاں پر فعل (کسب) کو دوبار لانے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

اول: تحسین کلام کے لیے، کسب کومکرر لایا گیا، اور دونوں کی تصریف (صیغہ کی شکل) الگ الگ کردی گئی، جیسا کہ اس فرمان باری میں ہے:

فمهل الكافرين أمهلهم رويدا [سوره طارق/١٧]

یہ جواب ابن عطیہ نے دیا ہے۔(۳۲)

دوم: اس لیے کہ نیکیوں کی تحصیل بلاتکلف ہوتی ہے، کیوں کہ نیکیاں حاصل کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ جب کہ برائیاں کرنے والا، بہ تکلف، اللہ کی ممانعت کے پردہ کو چاک کرتا ہے اور اس سے تجاوز کرجاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ''مبالغہ'' (یعنی صیغہ کی ساخت میں اضافہ) اختیار کیا گیا۔ اسی معنی کے پیش نظر اس آیت میں یہ دونوں الگ الگ صیغے اختیار کرنا مستحسن ہے۔

زمخشری اور ابن عطیہ دونوں کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شرو سیئات کے ارتکاب میں تکلف اور اعتمال ہوتا ہے؛ لیکن اس کے سبب کی توجیہ دونوں نے الگ الگ کی ہے۔

زمخشری کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس اپنی پسندیدہ چیز کی طرف راغب ہوتا اور کھنچتا ہے، اور ابن عطیہ نے کہا کہ اس کا سبب یہ کہ اس میں تکلف اور اللہ کی طرف سے ممانعت کے حجاب کو چاک کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان معصیت کا ارتکاب بلاتکلف نہیں کرتا ہے۔ سجاوندی کی رائے بھی قریب قریب وہی ہے جو ابن عطیہ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "افتعال'' میں التزام ہوتا ہے، اور شر انسان کے اپنے سر ہی لازم ہوتا ہے جب کہ خیر میں انسان دوسرے کو شریک کرسکتا ہے کہ کسی کی رہ نمائی کردی یا سفارش کردی۔ (۳۳)

نسفی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''نیکی کے لیے ''کسب'' کا اور برائی کے لیے ''اکتساب'' کا صیغہ استعمال کیا گیا اس لیے کہ افتعال کے وزن میں ''انکماش'' (سکڑنا) ہے اور برائی کے وقت، نفس سکڑتا ہے، جب کہ نیکی کے لیے، تکلف کرتا ہے''۔ (۳۴)

حواشی

(۱) رازی ۵۲۱/۶۔

(۲) ابن عاشور تفسیر آیت۔

(۳) زمخشری تفسیر آیت۔

(۴) آلوسی۲/۳۔

(۵) ابوحیان۲/۶۰۱؛زمخشری تفسیر آیت؛آلوسی۲/۳۔

(۶) زمخشری تفسیر آیت؛رازی۶/۵۲۱؛ابن عاشور۳/۱۳؛ابوحیان۲/۶۰۳۔

(۷) آلوسی۲/۳۔

(۸) ابوحیان۲/۳۰۶۔

(۹) ابوسعود۳/۲۴۵؛آلوسی۲/۳۔

(۱۰) ابن عاشور تفسیر آیت؛ابوسعود۳/۲۴۵؛آلوسی۳/۴۔

(۱۱) رازی۸/۷-۹

(۱۲) ابن عاشور تفسیر آیت۔

(۱۳) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۱۴) ابن عاشور تفسیر آیت؛رازی۷/۶۱؛ابوحیان۲/۶۹۱؛ابوسعود۱/۲۶۶؛آلوسی۳/۴۴۔

(۱۵) ابن عاشور تفسیر آیت۔

(۱۶) آلوسی۳/۴۴۔

(۱۷) رازی۷/۶۷۔

(۱۸) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۱۹) زمخشری تفسیر آیت؛ابوحیان تفسیر آیت۔

(۲۰) رازی۷/۱۱۷؛ابوحیان۲/۲۳۷؛ابوسعود۱/۲۷۰؛آلوسی۳/۵۵۔

(۲۱) ابن عاشور۳/۹۸۔

(۲۲) رازی۷/۱۷؛ابوحیان تفسیر آیت؛ابن عاشور تفسیر آیت؛ابوسعود۱/۲۷۰؛آلوسی۳/۵۵۔

(۲۳) زمخشری تفسیر آیت؛ابن عاشور۳/۹۸؛ابوسعود۱/۲۷۰؛آلوسی۳/۵۵۔

(۲۴) ابوحیان تفسیر آیت،ابن عاشور۳/۹۹۔

(۲۵) رازی۷/۱۱۷؛ابوحیان۲/۲۳۷۔

(۲۶) رازی۷/۱۱۷؛ابوحیان۲/۲۳۷۔

(۲۷) رازی۷/۱۱۷۔

(۲۸) رازی۷/۹۱؛ابوحیان تفسیر آیت؛ابوسعود۱/۲۷۰؛آلوسی۳/۵۶۔

(۲۹) ابوسعود۱/۲۷۰؛آلوسی۳/۵۶۔

(۳۰) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۳۱) زمخشری تفسیر آیت؛ابوحیان تفسیر آیت؛ابوسعود۱/۲۷۱؛آلوسی۳/۵۶۔

(۳۲) دیکھئے:ابوحیان تفسیر آیت۔

(۳۳) دیکھئے:ابوحیان تفسیر آیت۔

(۳۴) نسفی تفسیر آیت؛بیضاوی۱/۵۸۶۔

❁ ❁ ❁

درسِ ختمِ بخاری شریف

افادات: مفتی عمر فاروق لوہاروی
شیخ الحدیث دارالعلوم لندن - یوکے
ترتیب: الیاس لوہاروی (جامعہ اسلامیہ، ڈابھیل)

الحمد للّٰہ رب العالمین. والصلاۃ والسلام علی سیدنا ومولانا محمد خاتم النبیین، وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین، وعلی کل من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین.

اما بعد: قال النبي ﷺ : الراحمون یرحمھم الرحمن - تبارك و تعالٰی - ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء. رواہ ابوداود والترمذی واحمد عن عبد اللّٰہ بن عمرو بن العاص رضی اللّٰہ عنھما.

حدیثِ مسلسل بالاوّلیت اوراس کی سند

یہ حدیث پاک جواس وقت پڑھی گئی ہے، اسے حضراتِ محدثین کی اصطلاح میں ''حدیث مسلسل بالاوّلیت'' کہا جاتا ہے، اس لیے کہ ہر تلمیذ نے اپنے استاذ سے سب سے پہلے یہ حدیث سنی ہے۔ طالبات کا تسلسل بالاوّلیت قائم کرنے کے لیے اس کو یہاں سب سے پہلے تلاوت کیا گیا ہے۔

حدیث مسلسل بالاوّلیت کے متعلق یہ بات ملحوظ رہے، کہ یہ تسلسل راویٔ حدیث سفیان بن عیینہ تک ہی ہے، جیسا کہ حافظ شمس الدین الجزری رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ سفیان بن عیینہ اور ان کے اوپر کے رواۃ: عمرو بن دینار، ابوقابوس مولیٰ عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے اس کو مسلسل روایت نہیں کیا ہے۔ اور جنھوں نے سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ یا ان سے اوپر تسلسل کو پہنچایا، ان کو مغالطہ ہوگیا ہے۔

یہاں دوسری بات یہ قابلِ لحاظ ہے، کہ ''الراحمون یرحمھم الرحمٰن'' کے بعد

"تبارك وتعالیٰ" روایت میں نہیں ہے، اسی لیے علامہ ابن الجوزی اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمہما اللہ وغیرہ نے اس کو ساقط کر دیا ہے، اور بعضوں نے اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر کے وقت ثنا، کے لیے زیادہ کیا ہے۔ حدیث شریف کی تلاوت کرنے والے کے لیے آداب میں سے قرار دیا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر کے وقت ان جیسے کلمات کہے، اگر چہ لکھے ہوئے نہ ہوں۔

حدیث مسلسل بالاولیت میں میری چند اسانید ہیں، جن میں سے سرِ دست دو شیوخ کی ایک سند نقل کرتا ہوں:

محدث العصر حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم العالیہ شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور، یوپی، الہند اور حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین صاحب ندوی دامت برکاتہم (رئیس الجامعہ الاسلامیہ، اعظم گڑھ، یوپی، الہند) سے سب سے پہلے یہ روایت میں نے سنی۔ ان دونوں حضرات نے یہ روایت سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ سے سنی۔ انھوں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نور اللہ مرقدہ سے، انھوں نے حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے، انھوں نے حضرت شاہ اسحاق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے، انھوں نے اپنے نانا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اور انھوں نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنی۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سند از اوّل تا آخر ان کی کتاب "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" میں مذکور ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہم کی اس سند کے علاوہ شیخ احمد قلاش، شیخ احمد بن عبداللہ اور شیخ احمد بن عبدالسلام سوڈانی وغیرہ کئی مشائخ کی اور بھی اسانید ہیں۔

وبالسند المتصل منا الیٰ امیر المؤمنین فی الحدیث: ابی عبدِ اللّٰہ محمدِ بنِ اسمٰعیلَ بنِ ابراهیمَ بنِ المغیرةِ بنِ بَرْدِزْبَةَ الجُعفیِّ البخاریِّ رحمه اللّٰه تعالیٰ رحمةً واسعةً الیٰ یوم الدین، ونفعَنا بعلومه، وحشرَنا فی زُمرتِه، آمین، انه قال:

باب قول اللّٰه تعالی: ﴿ونضع الموازین القسط لیوم القیامة﴾ وأن اعمالَ بنی آدمَ وقولَهم یُوزَن، وقال مجاهدٌ: القسطاسُ العدلُ بالرومیة. ویقال: القسطُ مصدرُ المقسطِ وهو العادلُ، واما القاسطُ فهو الجائر.

اصولِ ستہ کے مصنّفین کی علو ہمتی ایک حدیث کے آئینہ میں

یہ ایک حقیقت ہے، کہ "صحیح بخاری" حدیثِ پاک کی ان معروف ومشہور چھ کتابوں میں امتیازی مقام کی حامل ہے، جنھیں ''اصولِ ستہ'' یا ''کتبِ ستہ'' کہا جاتا ہے۔ میں ہمارے اِس دیار میں عامۃً یا عموماً ''کتبِ ستہ'' یا ''اصولِ ستہ'' ہی کا لفظ استعمال کرتا ہوں، اس لیے کہ مخاطبین میں مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ ہوتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو، کہ ان میں سے کسی کا نظریہ اس بارے میں مختلف ہو، اور وہ ''صحاح ستہ'' بولنا اور لکھنا صحیح نہ سمجھتا ہو، اور وہ صحاح ستہ کا لفظ سن کر پوری ہی بات کو رد کردے، ویسے برصغیر: ہندو پاک اور بنگلہ دیش والوں کی اصطلاح ''صحاح ستہ'' ہی کی ہے، اور لامشاحّة في الاصطلاح. ''اصطلاح میں کوئی مناقشہ اور جھگڑا نہیں ہے''۔

یوں تو ان سب کتابوں کے مصنّفین نے طلبِ علم حدیث اور جمع احادیث کے لیے جاں گُسَل محنت ومشقت برداشت کی ہے، اور اس علو ہمتی اور بلند حوصلگی کا ثبوت دیا ہے، جس کی طرف "صحیح بخاری" وغیرہ کی ایک حدیث پاک میں اشارہ فرمایا گیا ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ آپ پر سورۂ جمعہ کی یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی: ﴿وآخرين منهم لما يلحقوا بهم﴾ (الجمعة: ۳) (اور اللہ وہی ہے، جس نے اُمّیین کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی آپ کو مبعوث فرمایا، جو ان میں سے ہونے والے ہیں، لیکن اب تک ان میں شامل نہیں ہوئے) تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تین مرتبہ دریافت کیے جانے کے بعد آپ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر اپنا دستِ مبارک رکھ کر ارشاد فرمایا: لو كان الايمانُ عند الثريا لَنالَه رجالٌ مِن هؤلاء. ''اگر ایمان ثُریّا ستارہ کے پاس ہوتا، تو ان لوگوں میں سے یعنی ابناءِ فارس یا عجمیوں میں سے کچھ لوگ اس کو پالیتے۔''

"مسندِ احمد" کی ایک روایت میں "لو كان العلمُ عند الثريا" وارد ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے، کہ اگر دین وعلم بعید سے بعید تر ہوتا، جس کو عامۃ الناس نہ پاتے، تو ابناءِ فارس اور عجمیوں میں سے کچھ لوگ اس کو پالیتے۔

بعض علماء نے اس کا مصداق ہمارے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "تبييض الصحيفة" میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور ان کے

تلمیذ رشید شیخ محمد بن یوسف رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ بلا شبہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ابناءِ فارس کے درمیان علم وفضل میں ذروۂ کمال پر فائز اور یگانۂ روزگار تھے، لیکن آپ نے پڑھ لیا ہے، کہ "صحیح بخاری"، "کتاب التفسیر" میں یہ روایت دو طریق سے آئی ہے۔ پہلے طریق میں راوی کو تردّد ہے، کہ "رجال" بصیغۂ جمع کہا، یا "رجل" بصیغۂ مفرد کہا، لیکن دوسرے طریق میں بلاتردّد "رجال" بصیغۂ جمع وارد ہوا ہے۔ اسی طرح دیگر کتب حدیث کی اکثر روایات میں "ناس" اور "رجال" مروی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہاں تنہا ایک شخص مراد نہیں؛ بلکہ بہت سے آدمی مراد ہیں، اسی لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے نزدیک اس سے مراد فقہاء اور محدثین کی ایک بڑی جماعت ہے، جس کا تعلق ''فارس'' سے ہے۔ اور محدث العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ ظاہر یہ ہے، کہ اس سے عجم کے وہ علماءِ کبار اور حاملینِ شریعت مراد ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی نصرت کے لیے کھڑا کیا، اور بلاشبہ ایسے حضرات عجم میں بڑی تعداد میں ہوئے، یہاں تک کہ کتبِ ستہ کے مصنّفین سب کے سب عجم سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

بندہ کہتا ہے، کہ حضرات محدثین کے مراد ہونے پر قرینہ یہ ہے، کہ حافظ ابونعیم اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے طریق سے اس روایت کی تخریج کی ہے، اس میں جہاں اور کلمات کا اضافہ ہے، وہیں یہ کلمہ بھی ہے: ویُکثِرون الصلاۃَ علَیّ. یعنی وہ مجھ پر بکثرت درود پڑھیں گے۔ اور ظاہر ہے، کہ حضرات فقہاء کرام کے مقابلے میں الفاظِ احادیث کے ساتھ حضرات محدثین کا اشتغال زیادہ ہوتا ہے، اس لیے بار بار رسول اللہ ﷺ کے اسم گرامی کے ذکر کی وجہ سے ان کا درود شریف پڑھنا بھی زیادہ ہی ہوگا۔

ابھی جیسا کہ ذکر کیا گیا، کتب ستہ کے مصنّفین سبھی عجم ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت میں جو "جُعفی" آتا ہے، اس کے متعلق آپ نے پڑھ لیا ہے، کہ وہ اس لیے نہیں کہ ان کا "بنو جُعفی" خاندان سے کوئی تعلق تھا، جو یمن کا ایک قبیلہ ہے؛ بلکہ آپ کے پردادا مغیرہ نے امیرِ بخارا "یمان بن اخنس جعفی" (امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ عبداللہ بن محمد المُسنَدی کے دادا کے دادا) کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، تو نسبت ولاءِ اسلام کی وجہ سے مغیرہ کو "جعفی" کہا جانے لگا، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت میں بھی "جعفی" پردادا کی نسبت سے آگیا۔

امام مسلم بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت میں "قُشَیرِی" آتا ہے اور "قُشَیرِی" بنوقُشیر کی طرف نسبت ہے، جو عرب کا ایک قبیلہ ہے۔ حافظ ابن صلاح رحمۃ اللہ علیہ کی رائے تو یہ ہے، کہ امام مسلم رحمہ اللہ نسبی اعتبار سے عربی ہیں، لیکن حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لعله من موالي قُشير. شاید امام مسلم رحمہ اللہ کی نسبت قُشَیر کی طرف اس لیے کردی گئی ہے، کہ ان کے بڑے بنوقشیر سے ولاء کا تعلق رکھتے تھے، یعنی ان کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھے۔ یا ممکن ہے، کہ آپس میں معاہدہ ہوگیا ہو، تو حلف کے تعلق کی بنیاد پر ان کو قشیری کہتے ہوں۔ امام مسلم رحمہ اللہ کے سلسلۂ نسب میں پردادا کے بعد جو نام آتا ہے، یعنی کُوشاذ، یہ خالص فارسی لفظ ہے، اس سے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے "لعل" کا لفظ استعمال کیا ہے، جبکہ علامہ نسّابہ شرف الدین ابومحمد التونی نے جزماً مولیٰ قشير بن كعب" کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بہرحال کتبِ ستہ کے مصنّفین عجمی ہیں۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا عجمی النسل ہونا تو ایک مسلّم حقیقت ہے۔ ان کے پردادا مغیرہ کے والد "بَرْدِزْبَة"[1] فارسی النسل مجوسی تھے۔ سوچنے کا مقام ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے کیسا مقام عطا فرمایا! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ "بُخاریٰ" کے رہنے والے، عجمی شخص اور عجمی بھی ایسے، کہ "صحيح بخاری" عربی میں تالیف فرمارہے ہیں، لکھتے لکھتے ایک جگہ فارسی کا لفظ لکھ گئے، عجمی کلمہ جو عربی میں استعمال نہیں ہوتا، ان کی کتاب میں درآیا۔ "كتاب الحج" میں صفحہ ۲۲۶ پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ويُزادُ في هذا البابِ هَمُ هذا الحديثُ حديثُ مالك عن ابن شهاب، ولكني اريدُ ان ادخلَ فيه غيرَ معاد.

"اور اس باب میں بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے اس حدیث کا، یعنی حدیثِ مالک عن ابن شہاب کا (جو باب سابق میں ہے)، لیکن میں اس میں ایسی روایت ذکر کرنا چاہتا ہوں، جو غیر مکرر ہو"۔

---

[1] حضرت مولانا بدرعالم صاحب مہاجر مدنی نوراللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں:
"عام طور پر مؤرخین وشارحین نے اس لفظ کو اسی طرح ضبط کیا ہے، اور اس کے معنی کسان لکھے ہیں، لیکن روس کے ایک مشہور عالم سے میری مکاتبت ہوئی، تو انھوں نے اس لفظ کی صحیح تعریب "بر دازبة" قرار دی، یعنی دال کے بعد الف زائد ہے، اور اس کے معنی صیقل و ماہر کے بتائے۔ یہ تصریف ونحو کے بہت بڑے عالم ہیں، اور اُن بلاد کی زبانوں سے بھی پورے طور پر واقف ہیں، اس لیے ان کی تحقیق قابلِ اعتماد ہے۔" (تذکرہ ائمہ اربعہ ومشہور محدثین، ص:۳۸، حاشیہ:۲)

گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سند و متن کے اتحاد کے ساتھ تکرار کے روادار نہیں ہیں، اس سے بچتے ہیں، لیکن لگے ہاتھ یاد دلا دوں، کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمۂ ارشاد الساری میں ذکر فرمایا ہے، اس میں ''صحیح بخاری'' کی ایسی اکیس (۲۱) روایات مذکور ہیں، جو مکرر بالسند والمتن ہیں۔ علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت کا اضافہ فرمایا، تو کل بائیس (۲۲) روایات ہوگئیں۔ محدث العصر حضرت مولانا محمد یونس صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے ایک سو اٹھائیس (۱۲۸) روایات کا اضافہ فرمایا ہے، اس اعتبار سے مجموعی تعداد ایک سو پچاس (۱۵۰) ہوئی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ نے اس مجموعہ کا نام ''ارشاد القاصد الی ما تکرر فی البخاری باسناد واحد'' رکھا ہے۔

الغرض امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے شاید بے خیالی میں لفظ ''ھم'' عربی میں استعمال ہوگیا۔ یہ فارسی کا لفظ ہے، جو ''بھی'' کے معنی میں آتا ہے۔ ایسے عجمی شخص کی یہ کتاب جب عربوں میں پہنچی، تو انھوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لی، اور اس کا اعتراف کیا کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ھو الصحیح للبخاری. ''کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح ہے۔'' ایسے عجمی شخص جس کی چوتھی پشت میں غیر مسلم، لیکن اہل عرب اور سارے عالِم اسلام نے ان کو اپنا امام تسلیم کیا، اور ان کی جلالتِ قدر اور علوِشان کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ دیگر محدثین کی طرح بلکہ ان سے کسی قدر امتیاز واختصاص کے ساتھ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی حصولِ علم حدیث کے لیے جد وجہد اور کد وکاوش حدیث نبوی ''لو کان الایمان – اوالعلم– عند الثریا لنا له رجال من هؤلاء'' کی آئینہ دار تھی۔ طلب حدیث کے لیے راحت وآسائش کو خیرباد کہا، متعدد بلادِ اسلامیہ کی خاک چھانی، ہزاروں میل پاپیادہ اسفار کیے، فاقوں پر فاقے برداشت کیے، راتوں کی نیندیں قربان کیں، اور اس قدر محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں، کہ آج ہم اور آپ اس کا تصور کرکے بھی لرز اٹھتے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے چھ لاکھ احادیث کو تنقید کی چھلنیوں سے چھان کر اور تنقیح کے چھاجوں میں پٹک کر اس کتاب کی تالیف فرمائی۔ فنی اعتبار سے جانچنے اور پرکھنے کے سارے ذرائع استعمال کرنے کے بعد ان پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے اہتمام سے ہر حدیث پر غسل کیا، دو دو رکعت نماز پڑھی، اور استخارہ کیا، کہ آیا یہ حدیث اس کتاب میں لکھوں یا نہ لکھوں۔ استخارہ کے بعد

مکمل اطمینان وانشراح ہوگیا، تب اس حدیث کو کتاب میں درج فرمایا۔

"صحيح بخاری" کو "اصح الكتب بعد كتاب الله" یعنی کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہونے کا لقب یونہی محض عقیدت ومحبت میں نہیں دیا گیا؛ بلکہ وقت کے نُقّادِ حدیث اور علماءِ جرح وتعدیل نے خوردبین لگاکر اس کی ایک ایک حدیث کا جائزہ لیا، سند کو پرکھا، متن کو جانچا، اس طرح ایک ایک حدیث کی چھان پھٹک کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا اور پھر تقریباً پوری امت اس پر متفق ہوگئی۔

"صحيح بخاری" کے فضائل وبرکات اور خصائص ومَزایا کے کیا کہنے! امام ابوزید المروزی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے فقیہِ شافعی گذرے ہیں، وہ فرماتے ہیں، کہ میں ایک مرتبہ حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا، خواب میں نبیٔ اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی، آپ نے فرمایا: يا ابا زيد، الى متى تدرّس كتاب الشافعی، وما تدرّس كتابی؟ اے ابوزید! کب تک تم (امام) شافعی کی کتاب کے درس وتدریس میں لگے رہوگے، اور میری کتاب کا درس و تدریس نہیں کروگے؟'' میں نے عرض کیا: يارسول الله، ما كتابك؟ ''یارسول اللہ! آپ کی کتاب کونسی ہے؟'' نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: جامع محمد بن إسماعيل البخاری. ''محمد بن اسماعیل بخاری کی جامع۔'' رسول اللہ ﷺ نے اس کتاب کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ اس طرح کا خواب امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ غیر نبی کا خواب حجتِ شرعیہ نہیں، لیکن استیناس کے طور پر اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کو ایک شرف وامتیاز ایسا حاصل ہے، جو زمانۂ اسلام میں آج تک کتاب اللہ کے بعد کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہوسکا۔ اور وہ یہ ہے، کہ خانۂ کعبہ کے جوف میں، کعبۃ اللہ کے اندر کتاب اللہ کے بعد اگر کوئی کتاب مکمل پڑھی گئی ہو، تو یہ "صحيح بخاری" ہے۔ ۱۰۴۰ھ میں شیخ محمد علی صدیقی مکّی رحمہ اللہ صاحبِ دلیل الفالحین نے اس کو جوفِ کعبہ میں مکمل پڑھا ہے۔

تراجمِ ابواب کی باریک بینی

اس کتاب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے صنیع کا بہت اہم حصہ اور "صحيح بخاری" کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ان کے قائم فرمودہ عنوانات اور تراجم ابواب ہیں۔ کتب ستہ میں "صحيح مسلم" کے تراجم تو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے قائم نہیں فرمائے ہیں،

اس لیے اس کو چھوڑ کر بقیہ کتب خمسہ میں "صحیح بخاری" ادقُّ التراجم ہے۔ان تراجم ابواب کی حیثیت ایک مستقل علم کی ہے۔مشہور مقولہ ہے: فقهُ البخاری فی تراجمه. امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تراجم ان کے دقّتِ نظر اوران کے تفقّہ کے ترجمان ہیں۔ان ابواب وتراجم میں کس قدر علو ومعارف، اسرار ورموز، حقائق ودقائق، اور نِکات ولطائف پنہاں ہوں گے، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے، کہ علاّمہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدث العصر یہ تمنا کرتے تھے، کہ ان تراجم پر شیخ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ قلم اٹھاتے، تو نایاب چیز ہاتھ لگ جاتی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے تفردات اپنی جگہ، مگر تراجم ابواب میں ودیعت باریکیوں کا اندازہ لگانے کے لیے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کا یہ مقولہ ذکر کیا ہے۔اس جملہ کے وزن کو اوراس کی وقعت واہمیت کو وہ شخص سمجھ سکتا ہے، جو علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی علمی فخامت وعظمت سے کسی قدر واقفیت رکھتا ہو، یا علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ بات پڑھی یا سُنی ہو، جو شیخ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت نظر اور استحضار کی غمّاز ہے، کہ امام ابن تیمیہ کے سامنے گویا کتابیں کھلی ہوئی ہیں، يأخذ منها ما شاء، ويذر منها ما شاء. "ان میں سے جو چاہتے ہیں، لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں، چھوڑتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تراجم کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتے ہوئے حضرات علماء کو ایک ہزار سال سے زیادہ ہورہے ہیں، اس کے باوجود ابھی تک کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا، کہ اس دیار کے تمام موتی اس نے دریافت کرلیے ہیں، اورامام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مدارک کو اس نے پالیا ہے۔حضرت مولانا انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالمِ اسلام کے محدثِ کبیر اور علاّمۃ العصر فرماتے تھے، کہ بعض مواقع پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح مراد پر اب تک رسائی نہیں ہوسکی، جو کچھ شارحین لکھتے ہیں، وہ تخمینات وگمانات ہیں۔

صحیح بخاری کی آخری کتاب

"صحیح بخاری" کا یہ آخری باب ہے۔اس باب کی کتاب کونسی ہے؟ بالفاظِ دیگر "صحیح بخاری" کی آخری کتاب کونسی ہے؟ اس سلسلہ میں دو رائیں ہیں:

(۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہ کی رائے یہ ہے، کہ آخری کتاب "کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة" ہے۔ "بدء الوحی" سے کتاب کا آغاز ہے،

اور ”کتاب الاعتصام“ پر اختتام ہے۔ ”کتاب التوحید والرد علی الجهمية وغيرهم“ کوئی مستقل کتاب نہیں؛ بلکہ یہ ”کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة“ کا تتمہ وتکملہ ہے، کیوں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی عادت یہ ہے، کہ وہ اضداد کا ذکر بھی کرتے ہیں، اسی لیے ”کتاب الإيمان“ میں ”کفردون کفر“، ”المعاصي من أمرالجاهلية“، ”ظلم دون ظلم“ اور ”علامة المنافق“ جیسے ابواب الکفر ذکر کیے ہیں، ”کتاب العلم“ میں ”رفع العلم وظهور الجهل“ کا باب ذکرکیا ہے، ”کتاب الاستسقاء“ میں قحط سالی کی بددعا کا باب ذکر کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جب ابواب البدعۃ، ”کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة“ کے اضداد میں سے ہیں، تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عادتِ مستمرہ کے مطابق کتاب الاعتصام کے بعد ان کو ذکر کیا۔ چونکہ ابواب البدعۃ زیادہ تھے، اس لیے کتاب کا عنوان قائم کرکے کہہ دیا: ”کتاب الرد علی الجهمية وغيرهم“.

اس اعتبار سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وحی سے اپنی کتاب کو شروع فرمایا، گویا کتاب اللہ سے آغاز فرمایا، اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ جو کتاب اللہ کا بیان وشرح ہے، ان کو مضبوطی سے تھامنے پر اپنی کتاب کو ختم فرمایا۔ فنعمت البداية ونعمت النهاية.

(۲) عامۃ الشراح کی رائے یہ ہے، کہ ”صحيح بخاری“ کی آخری کتاب ”کتاب التوحيد“ ہے۔ یعنی کتاب التوحید ایک مستقل کتاب ہے۔ کتاب الاعتصام کا تکملہ نہیں ہے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے، کہ اس کتاب -عنوان- کے لفظ میں نسخوں کا اختلاف ہے: (۱) ”کتاب التوحيد“. نسفی اور حماد بن شاکر کے نسخوں میں اور فربری سے نقل کرنے والے اکثر رُواۃ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ (۲) مستملی نے کتاب التوحيد کے بعد والرد علی الجهمية وغيرهم کا اضافہ نقل کیا ہے۔ یعنی پورا عنوان اس طرح ہے: ”کتاب الوحيد والرد علی الجهمية وغيرهم“. (۳) ابن بطال اور ابن التین رحمہما اللہ نے ”کتاب رد الجهمية وغيرهم التوحيد“ نقل کیا ہے؛ البتہ ”المكتبة الازهرية“ کے نسخہ شرح ابن بطال میں عنوان مستملی کی طرح ہے۔

کتاب التوحید آخر میں لانے کی وجوہات

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب وغریب صنیع اور طریقہ اختیار فرمایا ہے، کہ ”کتاب

التوحید" کوآخر میں لائے ہیں۔ان کے پیش نظر اس میں کیا اسباب و وجوہ، کیا حکم ومصالح اور کیا نکات ولطائف ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔حضرات علماء کرام کے کلام سے مستفاد چند وجوہ ذکر کرتا ہوں:

(۱)....حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ: شیخ الاسلام ابوحفص عمر البلقینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ انسان کی عزت وآبرو کی حفاظت اور عذاب سے حفاظت کے لیے اگر کوئی چیز اصل الاصول اور بنیاد ہے، اولاً بھی اور آخراً بھی، دنیا میں بھی اور عقبیٰ میں بھی، تو وہ ''توحید'' ہے۔ گویا عصمت وتحفظ کا نقطۂ آغاز بھی توحید ہے، اور نقطۂ اختتام بھی توحید ہے۔اس لیے "کتاب التوحید" کوآخر میں لائے، اوراس پر اپنی کتاب کوختم فرمایا۔

(۲)....دین کی اساس اور بنیاد ''ایمان'' ہے، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے آغاز میں "کتاب الایمان" کو رکھا۔(اور چوں کہ ایمان کی بنیاد وحی پر ہے، اس لیے ''بدء الوحی'' کومقدم کیا) اور "کتاب الایمان" میں دو انداز سے گفتگو ہوسکتی تھی، ایک تو ایجابی پہلو سے، اور دوسرے سلبی پہلو سے۔ایجابی پہلو سے جو کلام کرنا تھا، وہ "بدء الوحی" کے بعد "کتاب الإیمان" میں کرچکے۔اب یہاں سلبی پہلو سے کلام کررہے ہیں، کہ دیکھو! فرقِ باطلہ کے عقائد یہ ہیں، ان کے عقائد سے اپنے آپ کو بچاتے رہنا۔تو آخر میں بھی دین کی اساس ''ایمان'' ہی کا ذکر فرمارہے ہیں، لیکن سلبی پہلو سے۔

(۳)....نجات کا مدار توحید پر ہے، اس لیے "کتاب التوحید" کوآخر میں لائے۔

(۴)....احکام سب کے سب کتاب وسنت کے محتاج ہیں، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "الاعتصام بالکتاب والسنة" کا عنوان قائم فرمایا تھا، اوراس کے ذیل میں کتاب وسنت سے استنباط واجتہاد کے احکام اور اختلاف کی کراہت کا ذکر کیا تھا۔اور قرآن وسنت سے استنباط کبھی موجبِ رُشد وہدایت ہوتا ہے، اور کبھی موجبِ ضلالت وگمراہی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿یضل به کثیرا ویهدی به کثیرا﴾. (البقرة:۲٦) ''اللہ تعالیٰ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتے ہیں، اوراس سے بہتوں کو ہدایت کرتے ہیں۔'' اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے استنباطِ ضال سے احتراز کے لیے "الرد علی الجهمية وغيرهم" کا ترجمہ منعقد کیا، اور یہ ثابت فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے یہ معنی ومطلب اخذ کرنا، کہ صرف اس کی ذات کو مانا جائے، اوراس کی صفات کوتسلیم نہ کیا جائے، سراسر غلط اور گمراہی ہے؛ بلکہ توحید کا مطلب یہ ہے،

کہ اللہ کی ذات کو ایک مانا جائے، اور اس کی صفات کو تسلیم کیا جائے، یہی راہِ ہدایت ہے، اور یہی اہل سنت والجماعت کی توحید ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا، کہ "الرد علی الجهمية" اور "کتاب التوحيد" یہ دونوں عنوان دیکھنے میں متباین سے نظر آتے ہیں، لیکن درحقیقت دونوں کا حاصل ایک ہے، اس لیے کہ "کتاب التوحيد" کے عنوان سے اہل سنت والجماعت کی توحید ثابت ہوگی، تو ذات کی وحدت کے ساتھ صفات خودبخود ثابت ہوں گی۔ اور جب صفات کا ثبوت ہوگا، تو منکرینِ صفات کی تردید ہوجائے گی، اور فرقِ باطلہ کی توحید مسترد ہوجائے گی، یہی "الرد علی الجهمية وغيرهم" کے عنوان کا حاصل ہے۔

باب مذکور کی کتاب التوحید کے ساتھ وجوہِ مناسبت

عامّۃ الشراح کے قول پر "کتاب التوحيد" آخری کتاب ہے، اور توحید کا مقصود تو ذات و صفات کو بیان کرنا ہے، تو اس آخری باب – باب قول الله تعالیٰ ونضع الموازين القسط ليوم القيامة – کی جس میں وزنِ اعمال کا ذکر ہے، "کتاب التوحيد" کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟

(۱)....صاحب الخیر الجاری شیخ ابویوسف یعقوب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ "کتاب التوحيد" کا عنوان ایسا ہے، جیسا کہ متکلمین کے یہاں ''الٰہیات'' کا عنوان ہوتا ہے۔ متکلمین الٰہیات کا عنوان قائم کرتے ہیں، جس میں اللہ کے وجود اور ذات وصفات ہی سے بحث ہونی چاہیے تھی، لیکن اس میں ذات، صفات، نبوّات، خلقِ افعال اور وزنِ اعمال کے مسائل ذکر کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیک اسی طرح کیا ہے۔

محدث العصر حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں، کہ یہ توجیہ میرے دل کو نہیں لگتی، کیوں کہ الٰہیات کے عنوان کے تحت صرف یہی چند مسائل ذکر نہیں کیے جاتے؛ بلکہ عقائد کے تمام بنیادی مسائل ذکر کیے جاتے ہیں۔ نیز صاحب الخیر الجاری نے جس باب کو نبوّات سے متعلق قرار دیا ہے، یعنی "باب قول الله يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك الخ" (صحیح بخاری، ص:۱۱۲۳، ج:۲) اس میں تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تلاوت ومتلو کے فرق کو واضح کیا ہے۔

(۲)....محدث العصر حضرت مولانا محمد یونس صاحب مدظلہم فرماتے ہیں، کہ "کتاب

التوحد“ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذات وصفات کے متعلق بیان فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں: (۱) صفاتِ ذات۔ اور (۲) صفاتِ افعال۔ اشعریین کے نزدیک صفاتِ ذات وہ صفات کہلاتی ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ ازل وابد میں متصف ہیں، اور وہ سات صفات ہیں: حیاۃ، علم، قدرۃ، ارادہ، سمع، بصر اور کلام۔ اور صفاتِ افعال وہ صفات کہلاتی ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ ازل میں تو متصف نہیں، ابد میں متصف ہیں۔ اور یہ اصلاً صفات نہیں ہیں؛ بلکہ قدرت وارادہ جو صفاتِ ذات میں سے ہیں، ان کے متعلقات وشئون ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت اور صفت ارادہ کا تعلق جب کسی چیز سے ہوتا ہے، تو اس تعلق کے بعد اللہ تعالیٰ کے لیے ایک صفت ظاہر ہوتی ہے، جیسے ترزیق سے تعلق ہو، تو اللہ تعالیٰ کے لیے صفت رازق ورزّاق ظاہر ہوگی۔ تخلیق سے تعلق ہو، تو صفت خالق وخلّاق ظاہر ہوگی۔ ماتریدیہ کہتے ہیں، کہ صفاتِ ذات وہ ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ متصف ہیں، اور ان کی اضداد سے متصف نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ صفت حیاۃ سے متصف ہیں: حیّ ہیں، موت سے متصف نہیں: میّت نہیں۔ علم سے متصف ہیں، جہل سے متصف نہیں۔ قدیر ہیں، عاجز نہیں۔ مرید ہیں، مسلوب الارادہ نہیں۔ سمیع ہیں، اصم نہیں۔ بصیر ہیں، اعمیٰ نہیں۔ متکلم ہیں، اخرس نہیں۔ اور صفاتِ افعال وہ صفات ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ متصف ہیں، اور ان کی اضداد سے بھی متصف ہیں۔ اللہ تعالیٰ معطی ہیں، تو مانع بھی ہیں۔ محی ہیں، تو ممیت بھی ہیں۔ نافع ہیں، تو ضارّ بھی ہیں وغیرہ۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب التوحید“ میں صفاتِ ذات کی طرح صفاتِ افعال کو بھی بیان کیا ہے، اور وزنِ اعمال صفاتِ افعال میں سے ہے، اس طرح اِس باب کی ”کتاب التوحید“ کے ساتھ مناسبت ہوگئی۔

(۳)....شیخ ابن القیم اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں تلاوت اور متلو کے فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ماقبل میں عرض کیا گیا، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”کتاب التوحید“ میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر فرمایا ہے، اور خاص طور سے صفتِ کلام کے متعلق تو متعدد ابواب قائم کیے ہیں۔ کلام کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ ہے، کہ تلاوت ومتلو میں فرق ہے یا نہیں؟ یہی وہ مسئلہ ہے، جس کی وجہ سے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو زبردست ابتلاء وآزمائش پیش آئی۔

پہلے معتزلہ نے یہ نظریہ چلایا، کہ کلامِ الٰہی مخلوق ہے: حادث ہے۔ اس فتنہ کے مقابلے کے

لیے اللہ تعالیٰ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب فرمایا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بشر احمد علی بلوی تصیبه. ''احمد کو (جنت کی) بشارت دے دو اس آزمائش کے ساتھ، جو انہیں پہنچے گی۔'' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تلامذہ سے فرمایا، کہ امام احمد کے پاس یہ بشارت کون لے کر جائے گا؟ امام طحاوی رحمہ اللہ کے ماموں امام اسماعیل مزنی رحمہ اللہ نے عرض کیا، کہ میں لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ امام مزنی گئے۔ بعض حضرات نے لکھا ہے، کہ ربیع بن سلیمان مُرادی رحمہ اللہ گئے تھے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، جیسا کہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''سِیَر أعلام النُّبلاء'' میں اس کی تصریح کی ہے۔ امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے جا کر جب امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کو یہ بشارت سنائی، تو انھوں نے سن کر فرمایا، کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ میں ضعف و کمزوری کو محسوس فرمایا ہے۔ گویا آپ نے برائے تقویت و تسلی یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔ عزوۂ تبوک سے متعلق حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے بشارت لے کر آنے والے امام مزنی کو اپنا کُرتا اتار کر دے دیا۔ کرتا لے کر جب وہ واپس آئے، تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، کہ کرتا تو تمہارا حق ہے، وہ تو میں تم سے طلب نہیں کرتا، نہیں مانگتا، لیکن اتنا کرو، کہ اس کرتے کو پانی میں بھگو کر نچوڑو، اور وہ پانی مجھے دے دو، وہ عُصارہ مجھے دے دو۔ عُصارہ دینے پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں سے کچھ نوش فرمایا، اور کچھ اپنے بدن پر ملا۔

بہرحال اس فتنہ کے مقابلے کے لیے امام اہل السنۃ: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اٹھے، حق کی چٹان بن کر سامنے آئے، اور بڑی استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کیا۔ خلقِ قرآن کے قائل ہونے سے انکار پر معتصم بن الرشید نے آپ کو کئی کوڑے لگوائے۔ امام احمد فرماتے ہیں، کہ جس دن مجھے کوڑے مارنے کے لیے نکالا گیا تھا، تو میں نے دیکھا، کہ پیچھے سے ایک آدمی میرے کپڑے کھینچ رہا ہے، میں نے مڑ کر دیکھا، تو اس نے پوچھا: آپ مجھے جانتے ہیں؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگا: میں مشہور جیب تراش اور ڈاکو ابوالہیثم ہوں، سرکاری ریکارڈ میں یہ بات محفوظ ہے، کہ مجھے مختلف اوقات میں اٹھارہ ہزار کوڑے مارے گئے ہیں، لیکن میں نے حقیر و ذلیل دنیا کی خاطر شیطان کی اطاعت پر پوری استقامت کا مظاہرہ کیا، آپ تو دین حق کے ایک بلند ترین مقصد کے لیے قید ہوئے ہیں، اس لیے کوڑے کھاتے ہوئے دین کی خاطر رحمٰن کی اطاعت پر صبر واستقامت سے کام لیجیئے گا۔ اس کی اس بات سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا حوصلہ مزید مضبوط ہوا۔

محمد بن اسماعیل کہتے ہیں، کہ ”میں نے سُنا ہے، کہ امام احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے، کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا، تو چیخ مار کر بھاگتا۔“ ایک تازہ جلاّد پوری قوت سے صرف دو کوڑے لگاتا تھا، پھر دوسرا جلاّد بلایا جاتا تھا۔ امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے: اعطونی شیئا من کتاب اللّٰه او سنة رسوله حتی اقول به. میرے سامنے اللہ تعالیٰ کی کتاب یا اس کے رسول ﷺ کی سنت سے کچھ پیش کرو، تو میں اس کو مان لوں، اس کا قائل ہوجاؤں۔“ اٹھائیس مہینے تک آپ کو حبس وقید میں رکھا گیا، لیکن یہ تازیانے اور قید وبند آپ کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کرسکے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی بے نظیر ثابت قدمی اور استقامت سے یہ فتنہ تو ختم ہوگیا، لیکن اس کے بعد غلو کا دور شروع ہوا، اور دوسرے فتنہ نے سر اٹھایا۔ بعضوں نے یہ کہنا شروع کردیا، کہ جو متلو ہے وہی تلاوت ہے۔ متلو جیسے غیر مخلوق ہے: قدیم ہے، اسی طرح انسان جب قرآن کی تلاوت کرتا ہے، تو اس کی زبان وحلق سے نکلنے والی یہ آواز اور یہ تلاوت بھی غیر مخلوق ہے: قدیم ہے۔ کلام اللہ جس کاغذ پر لکھا جائے، اور جس روشنائی سے لکھا جائے، لکھے جانے کے بعد وہ کاغذ اور روشنائی بھی قدیم ہیں: غیر مخلوق ہیں۔ اس فتنہ کے مقابلے کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ میدانِ عمل میں آئے اور اس کے لیے مشقتوں کو برداشت کیا، حتی کہ وطن سے بے وطن ہوئے، اور وطن سے دور جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو واضح کیا، کھولا، اور بتایا، کہ متلو تو کلام الٰہی ہے، اور تلاوت پڑھنے والے کا فعل ہے، جو متلو پر وارد ہوتا ہے۔ دیکھیے! یہ کتاب ”صحیح بخاری“ ہے، اور ایک میرا اور آپ کا پڑھنا ہے۔ میرا اور آپ کا پڑھنا ہمارا فعل ہے، اور ”صحیح بخاری“ امام بخاری کی کتاب ہے، تو پھر کلامِ الٰہی کے مسئلہ میں کیسے کوئی یہ کہہ سکتا ہے، کہ جو تلاوت ہے، وہی متلو ہے؟ یا جو متلو ہے وہی تلاوت ہے؟ لہٰذا اس کا قائل ہونا پڑے گا، اور یہ تسلیم کرنا ہوگا، کہ متلو تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور تلاوت ہمارا فعل ہے: تلاوت کرنے والے کا فعل ہے۔ متلو تو قدیم ہے: غیر مخلوق ہے، لیکن تلاوت حادث ہے: مخلوق ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تلاوت اور متلو کے فرق کو ثابت کرنے کے لیے ”کتاب التوحید“ کے آخر میں کئی ابواب قائم کیے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کا آغاز ”باب قول اللّٰه فلا تجعلوا للّٰه اندادا“. (ص: ۱۱۲۱، ج: ۲) سے کیا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب مدظلہم کی رائے

یہ ہے، کہ اس سے ایک باب قبل "باب ذکر اللہ بالامر وذکر العباد بالدعاء والتضرع والرسالة والابلاغ" سے کیا ہے، اور آخرِ کتاب تک یہی مسئلہ ذکر فرمایا ہے۔

شیخ ابن القیم اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ فرماتے ہیں، کہ اس آخری باب میں بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تلاوت ومتلو اور وارد ومَوْرِد کے فرق کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ظاہر ہے، کہ قیامت کے دن بندوں کے اعمال کے لیے میزان قائم کی جائے گی، اور بندوں کے اعمال تولے جائیں گے، اور بندوں کے اعمال میں تلاوت بھی داخل ہے، لہٰذا تلاوت کا بھی وزن ہوگا۔ متلو اور مورِد جو اللہ کا کلام ہے، وہ نہیں تولا جائے گا۔

(۴).... علامہ کرمانی رحمۂ اللہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۂ اللہ نے "کتاب التوحید" میں جن صفات ومسائل سے بحث کی ہے، ان میں صفتِ کلام بھی ہے۔ اور اسی صفتِ کلام اور کلام اللہ کے مباحث پر اس کتاب کو ختم فرمایا ہے، اس لیے کہ وہی مدارِ وحی ہے، اور اسی سے احکام وشرائع ثابت ہوتے ہیں، اسی لیے "بدء الوحی" سے کتاب کا آغاز کیا تھا۔ اور جس سے آغاز کیا، اسی پر نہایت واختتام بھی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ باب مقصود بالذات نہیں ہے؛ بلکہ کلامِ الٰہی کی بحث پر مشتمل آخری مقصود بالذات باب "باب قرائة الفاجر والمنافق الخ" ہے۔ چوں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجلس کے آخر میں تسبیح وتحمید کی ترغیب دی ہے، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب کو مجلس علم کی طرح قرار دے کر یہ آخری باب "باب قول اللہ تعالی ونضع الموازین القسط لیوم القیامة" اس ارادہ سے لائے ہیں، کہ آخر کلام تسبیح وتحمید ہو، جیسا کہ اولِ کتاب میں حدیث اِنما الأعمال بالنیات بیانِ اخلاص کے لیے لائے تھے۔

(۵).... "کتاب التوحید" کے ساتھ عنوان میں "الرد علی الجهمية" کے الفاظ ہیں، اور یہ باب وزنِ اعمال کے منکرین کی تردید کے لیے ہے۔ چناں چہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں، کہ ظاہر یہ ہے، کہ یہ باب معتزلہ کے رد کے لیے ہے، کیوں کہ معتزلہ نے میزان کا انکار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے ظاہر سے بھی غرضِ باب یہی معلوم ہوتی ہے۔

اس پر اشکال یہ ہے، کہ اس اعتبار سے کتاب اور باب میں مناسبت نہیں ہے، کیوں کہ کتاب کا عنوان جہمیہ کی تردید کا تقاضہ کرتا ہے؛ حالانکہ جہمیہ وزنِ اعمال کے منکر نہیں؛ بلکہ معتزلہ منکر ہیں۔ اس کے تین جوابات ہیں:

(۱) امام شمس الدین محمد بن احمد حنبلی سَفَّارِینی نابلسی رحمۃ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے، کہ معتزلہ کو بھی جہمی کہا جاتا ہے۔ معتزلہ، نجّاریہ، ضراریہ وغیرہ مختلف فرقے پوری طرح جہم بن صفوان کے ہم عقیدہ اور ہم خیال نہیں ہیں، ان کے مسلک اور نظریے جُدا جُدا ہیں، مگر چوں کہ کسی نہ کسی درجہ میں عقیدۂ سلف سے ہٹے ہوئے ہیں، اور جہم کے قول کی طرف مائل ہیں، لہٰذا اِن سب کو جہمی کہا جاتا ہے۔

(۲) علامہ سیّد محمد زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ سے ثابت کیا ہے، کہ جہمیہ میں سے بھی بعض لوگ وزنِ اعمال کے منکر ہیں۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بڑے وسیع النظر ہیں۔

(۳) یہ اشکال اس صورت میں ہوتا ہے، جبکہ کتاب کے عنوان میں صرف "الرد علی الجهمية" کے الفاظ ہوں، جیسا کہ ہمارے سامنے موجود ہندوپاک کے مطبوعہ "صحیح بخاری" کے حاشیہ میں ایک نسخہ سے منقول ہے، لیکن باقی نسخوں میں "الرد علی الجهمية" کے ساتھ "وغیرهم" کا لفظ بھی ہے۔ اس اعتبار سے صرف جہمیہ کی تردید مقصود نہیں؛ بلکہ معتزلہ اور قدریہ کی تردید بھی مقصود ہے۔ اب کوئی اشکال نہیں، اور باب کی کتاب کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے۔

اس باب کو آخر میں ذکر کرنے کی وجوہات

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب کتاب کے آخر میں کیوں رکھا؟ حضرات علماءِ عظام سے منقول اس کی چند وجوہ ذکر کرتا ہوں:

(۱) اس باب میں وزنِ اعمال کا ذکر ہے، اور وزنِ اعمال کا معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے، اس لیے اس کو آخر میں رکھا۔

(۲) علامہ بُلقینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ وہ آخری معاملہ جس کے ذریعے کامیاب کا ناکام سے امتیاز ہوگا، میزانِ عمل کا ثقیل وخفیف ہونا ہے، اس لیے اس کو آخر میں رکھا۔ یا یوں کہیے، کہ وزنِ اعمال انسانی مساعی کا آخری نتیجہ اور تمام شرائع کی غایت الغایات ہے۔ یا کہیے کہ عمل انسانی کے ساتھ جو آخری معاملہ ہوگا، وہ تولنے کا ہوگا، اس لیے اس کو آخر میں رکھا۔

(۳) محدث العصر حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں، کہ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے، کہ جو چیز آخر میں ذکر کی جاتی ہے، وہ ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ اسی لیے ماہر مقررین کا دستور ہے، کہ جب وہ طویل تقریر کرتے ہیں، تو آخر میں اپنی تقریر کے مرکزی

مضامین کو اجمالاً ذکر کردیتے ہیں، تاکہ اس اجمال کے ضمن میں ماقبل کی ساری تفصیلات ضم ہوکر ذہن میں مستحضر ہوجائے۔ اور جب اجمال مستحضر رہے گا، تو تفصیل کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہوجائیگا۔

حدیث جبریل میں بھی آپ نے پڑھ لیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کی آخرِ حیاتِ مبارکہ میں حضرت جبریل علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے تھے، تاکہ تیئس سال متفرق طور پر جو احکام اور امورِ دین نازل ہوئے تھے، آپ کے سوالات اور رسول اللہ ﷺ کے جوابات سے مجلس واحد میں ان کی تقریر ہوجائے، استقرارِ شریعت ہوجانے کے بعد اس کا خلاصہ اور نچوڑ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے آکر منضبط ہوجائے۔

تو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کو آخر میں رکھ کر قاریٔ کتاب کو توجہ دلائی ہے، کہ دیکھ لو! قیامت کے دن تمہارے اعمال وزن کیے جائیں گے، جس کی حسنات بھاری ہوں گی، وہ تو فائز المرام اور کامیاب ہوگا، اس کو ایسی زندگی ملے گی، جو خوشیوں ہی خوشیوں کی زندگی ہوگی۔ اور جس کی سیئات بھاری ہوں گی، وہ خائب وخاسر اور ناکام و نامراد ہوگا، وہ دردناک گڑھے میں ٹھکانہ پانے کا مستحق ہوگا، اس دن کو یاد رکھنا چاہیے، اس کے لیے پہلے سے تیاری کرنی چاہیے۔

وزنِ اعمال کے بیان پر کتاب ختم کرنے کی وجوہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وضع میزان اور وزنِ اعمال کے بیان پر اپنی کتاب کو ختم کرکے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ انھوں نے اپنی اِس کتاب کو ایک ایسے میزان کے طور پر وضع کیا ہے، کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یعنی احادیثِ صحیحہ کے لیے ایک میزان ومعیار کے طور پر وضع کیا ہے۔ احادیث کی صحت معلوم کرنے کے لیے اس میزان کا سہارا لیا جائے گا، اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

یہ بات حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے علاّمہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ذکر کی ہے، لیکن داراحیاء التراث العربی، بیروت کی مطبوعہ ''شرح الکرمانی'' (طبع ثانی) میں یہ بات مذکور نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

شیخ الاسلام زکریا الانصاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس امید پر وزنِ اعمال کے بیان پر اپنی کتاب کو ختم فرمایا ہے، کہ ان کی کتاب بھی قیامت کے دن وزنی

اعمال میں سے ثابت ہوگی۔

بدء الوحی اور بابِ آخر میں مناسبات

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے وحی کے بیان کواوّلِ کتاب میں رکھا،اوروزنِ اعمال کے باب کوآخرِکتاب میں رکھا،اس میں بھی نہ معلوم کتنی حکمتیں اور مصلحتیں ہوں گی۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ وحی کواوّلِ کتاب میں رکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ بندے کا اپنے رب کے ساتھ اوّل معاملہ وحی ہی سے قائم ہوتا ہے، اس اعتبار سے یہ ایمان واعمال کا مقدمہ ہے،اس لیےاس کواولِ کتاب میں رکھا ہے۔

اس پر بناء کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے، کہ وزنِ اعمال کوآخرکتاب میں اس لیے رکھا، کہ عام انسانوں کےاعمال پرمرتّب ہونے والی جزاوسزا کے لیے وزنِ اعمال مقدمہ ہے۔اس اعتبار سےاولِ کتاب اورآخرِکتاب میں مناسبت ہے۔

بندہ کے خیال میں ایک مناسبت یہ ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ کا معتد بہ حصہ ایک خاص ترتیب کےساتھ جمع کرنا چاہتے ہیں،اوران کامنبع وسرچشمہ وحیٔ الٰہی ہے، اس لیے وحی کے بیان سے کتاب کا آغاز کیا۔اوروحی کا اختتام حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے مطابق ﴿واتقوا یوما ترجعون فیه الی اللّٰه ثم توفی کل نفس ما کسبت وهم لا یظلمون﴾ (البقرة: ۲۸۱) پر ہوا۔جس میں اُس دن سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے،جس میں انسانوں کواللہ تعالیٰ کی پیشی میں لایا جائے گا، پھر ہر شخص کواس کے کیے کا پوراپورابدلہ ملے گا،اوران پرکسی قسم کاظلم نہ ہوگا۔اس لیےامام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آخری وحی سے مستفادموقف ومحشر کی آخری کارروائی وزنِ اعمال کوآخرِ کتاب میں رکھا ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

پہلی حدیث اورآخری باب میں مناسبات

"صحیح بخاری" کی پہلی حدیث اور اِس آخری باب میں مناسبت کے سلسلے میں بھی چنداقوال سن لیجیے:

(۱)...علامہ سراج الدین بُلقینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث اِنما الأعمال بالنیات سے جس کاتعلق دنیا سے ہے، کتاب کوشروع فرمایا،اورانسان

کے اعمال کے وزن پر ختم فرمایا (جس کا تعلق آخرت سے ہے)، اس سے اس بات کی طرف اشارہ کیا، کہ اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول فرمائیں گے، اور میزانِ عمل میں وہی اعمال ثقیل ہوں گے، جو خلوصِ نیت سے انجام دیے گئے ہوں۔

(۲)... علامہ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ ہر عمل کا مبدأ اور اوّل نیت ہے اور ہر عمل کا آخر وزن ہے، کیوں کہ وزن کے بعد تو جزا ہی ہے۔ تو عمل کے لیے تیار کی جانے والی کتاب کی بدایت ونہایت میں عمل کی بدایت ونہایت کو لائے ہیں۔ بدایت عمل یعنی نیت کو بدایت کتاب میں لائے، اور نہایت عمل یعنی وزن کو نہایت کتاب میں لائے۔

(۳)... علامہ ابوالحسن سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ حدیث انما الأعمال بالنیات میں حُسنِ نیت کی طرف اشارہ تھا۔ اب مسائل توحید میں سے وزنِ اعمال پر اپنی کتاب کو ختم فرمارہے ہیں، اس لیے کہ اعمال کا وزن: اس کا ثقیل ہونا اور خفیف ہونا عامل کی نیت کے اعتبار سے ہے، تو ان مسائل توحید میں بھی حسن نیت کی طرف ارشاد ورہنمائی ہے، اس طرح بدایتاً ونہایتاً حسنِ نیت کی مداومت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(۴)... مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب نوراللہ مرقدہ نے "فضل الباری" میں اس موضوع پر مختلف عناوین وتعبیرات سے کلام کیا ہے۔ میں ان کی ایک تقریر ذکر کرتا ہوں:

حضرت مسیح الامت نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں، کہ ہر عمل کا ایک مبدأ ہوتا ہے، اور ایک منتہاء۔ مبدءِ اعمال نیت واخلاص ہے، اس کو اولِ کتاب میں ذکر فرمایا۔ اور منتہاء اعمال ثمرات اور ان اعمال کے نتائج ہیں، مگر ثمرات اور نتائج حسب اعمال ہوں گے۔ اور یہ اعمالِ حسنہ وسیئہ کا تفاوت بندوں کے سامنے وزن سے ظاہر ہوگا، اس لیے وزنِ اعمال کا ترجمہ قائم کرکے ثمراتِ اعمال اور ثمرات کا محل ومقام جو کہ آخر حیات انسانی سے وابستہ ہے، آخر کتاب میں ذکر فرمایا۔ تو اولِ اعمال کو اولِ کتاب میں اور آخر اعمال کو آخر کتاب میں ذکر فرمایا۔

حدیث پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے آیت قرآنیہ کو بھی ذکر کرنے کی وجہ

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب ہم ترجمۃ الباب کی وضاحت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: باب قول اللہ تعالیٰ.

"صحیح بخاری" میں آپ نے دیکھا ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی ابواب میں

باب کی مناسبت سے آیاتِ قرآنیہ کو درج فرمایا ہے، یا چند یا ایک لفظ کو ذکر کرکے آیات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ "کتاب التوحید" کے ابواب میں تو بطور خاص اس کا اہتمام والتزام فرمایا ہے۔ "کتاب التوحید" کے ابواب میں اس اہتمام والتزام کی وجہ یہ ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ان ابواب میں اللہ تعالیٰ کی توحید ذات کے اثبات کے ساتھ اس کی صفات کو ثابت کرنا ہے، اور اس کا تعلق اعتقادیات کے ساتھ ہے، جن کے اثبات میں قطعی دلیل درکار ہے، اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صفات کی احادیث کو "کتاب التوحید" کے متفرق ابواب میں جمع فرمایا، تاکہ تواتر قدرِ مشترک ثابت ہوکر یہ احادیث اخبارِ آحاد ہونے سے نکل جائیں، اور مفید ظن نہ رہتے ہوئے مفید قطع ویقین ہوجائیں، پھر ہر باب میں قرآن مجید کی آیت سے اس کو مؤید کیا۔ اس اعتبار سے صفات باری تعالیٰ کا منکر قرآن وسنت دونوں کی مخالفت کرنے والا قرار پائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جتنی صفاتِ مقدسہ ہیں، ان کا ثبوت صرف احادیث سے نہیں؛ بلکہ کتاب اللہ سے بھی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام "کتاب الرد علی الجھمیة" ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے "فتح الباری" میں "صحیح بخاری" کی "کتاب التوحید" کی شرح وایضاح میں اُس کتاب سے کافی استفادہ کیا ہے۔ اُس کتاب میں امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے، کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ الشیوخ سلاّم بن ابی مطیع کی مجلس میں صفاتِ باری کے منکر مُبتدعین کا ذکر ہوا، تو انھوں نے فرمایا، کہ صفاتِ الٰہیہ کے بیان پر مشتمل احادیث کا انکار وہ کیسے کرسکیں گے؟ اللہ کی قسم! حدیث پاک میں جس کسی صفت کا بیان ہے، ٹھیک اسی طرح اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ان اللہ سمیع بصیر﴾. (لقمان:۲۸) ﴿یحذرکم اللہ نفسه﴾ (آل عمران:۳۰) ﴿ما منعك ان تسجد لما خلقت بیدی﴾. (صٓ:۷۵) ﴿وکلم اللہ موسیٰ تکلیما﴾. (النساء:۱۶۴) ﴿الرحمن علی العرش استوی﴾ (طٰه:۵) وغیرہ۔ سلاّم بن ابی مطیع عصر سے لے کر غروب تک صفاتِ باری پر مشتمل آیات تلاوت کرتے رہے۔

یہاں ضمناً ایک بات کی طرف اشارہ کرتا چلوں، کہ یہاں برطانیہ میں دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کا دوسرے مکاتب فکر والوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ ان میں سے بعض دیوبندیوں کو زک دیتے رہتے ہیں، کہ تم لوگ صفات میں تاویل کرنے والے ہو۔ لیکن آپ

کومعلوم ہونا چاہیے، کہ ہمارے مرکز الاسانید اور مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ کا نظریہ یہ تھا، کہ قرآن وسنت میں جو صفات جس طرح آئی ہیں، ان کو اسی طرح تسلیم کیا جائے، ان میں تاویل نہ کی جائے۔ اور یہی نظریہ وعقیدہ علمائے دیوبند کے سرخیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کا تھا، لہٰذا بلا کسی مرعوبیت کے دوٹوک کہیے، کہ ہم دیوبندی بھی مسئلۂ صفات میں بالکل سلف کے عقیدے کے حامل ہیں۔

بہرحال وزنِ اعمال پر دلالت کرنے والی حدیث پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آیت قرآنیہ بھی یہاں ذکر فرمائی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا اپنے لیے صیغۂ واحد اور جمع کا استعمال فرمانا

﴿ونضع الموازين القسط ليوم القيامة﴾۔ ''اور قیامت کے روز ہم میزانِ عدل قائم کریں گے۔''

﴿ونضع﴾: ہم رکھیں گے، ہم قائم کریں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کہیں واحد متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا ہے، کہیں جمع کا۔ جس مقام پر رحمت وشفقت کا مضمون ہوتا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ واحد متکلم کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں۔ جیسے ﴿اليوم اكملت لكم دينكم...﴾ (المائدة:۳) میں تکمیل دین وغیرہ کا ذکر ہے، جو سراسر نعمت ہے، اس لیے ''اکملت'' وغیرہ بصیغۂ واحد متکلم آیا ہے۔ اور جہاں شان جلال واستغناء اور عظمت کا بیان ہے، وہاں جمع کا صیغہ آیا ہے۔ جیسے یہاں ﴿ونضع الموازين...﴾ میں شان عظمت کا بیان ہے، اس لیے ''ونضع'' بصیغۂ جمع متکلم آیا ہے۔

صیغۂ خطاب میں اللہ تعالیٰ کے لیے صیغۂ واحد یا جمع؟

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے صیغۂ خطاب میں عامتاً صیغۂ واحد استعمال ہوا ہے؛ البتہ ایک جگہ بصیغۂ جمع آیا ہے۔ موت کے وقت کافر کو جب آخرت کا معاینہ ہونے لگتا ہے، اور وہاں کا عذاب سامنے آنے لگتا ہے، اس کی حکایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ جب ان میں سے کسی کے سر پر موت آ کھڑی ہوتی ہے اس وقت وہ کہتا ہے: اے میرے رب! مجھ کو واپس بھیج دیجیے، یعنی مجھ سے موت کو ٹال دیجیے اور پھر دنیا میں بھیج دیجیے۔ ﴿حتى اذا جاء احدهم

الموت قال رب ارجعون﴾. (المؤمنون: ۹۹) اس میں اللہ تعالیٰ کو صیغۂ جمع کے ساتھ خطاب ہے۔ اگرچہ اس میں دوسرا احتمال بھی بیان کیا گیا ہے، کہ جمع سے مراد تکرارِ فعل ہے۔ ربّ ارجع، ربّ ارجع. مگر تکرارِ فعل کے لیے صیغۂ جمع کا لانا خلافِ ظاہر ہے۔ اس لیے ہمارے اکابر کا اردو تقریر وتحریر میں اللہ تعالیٰ کے لیے صیغۂ واحد کی طرح صیغۂ جمع کا استعمال صحیح ہے۔

سنیئے! اللہ تعالیٰ کا ادب سب سے زیادہ ضروری ہے، مگر پھر بھی صیغۂ واحد کا استعمال اللہ تعالیٰ شانہ کے لیے خلافِ ادب نہیں، کیوں کہ عرف ہوگیا ہے۔ اور عرف میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے صیغۂ واحد غالباً اس لیے اختیار کیا گیا، کہ اس میں توحید پر دلالت زیادہ ہے، اور صیغۂ جمع میں بھی توحید محفوظ ہے لیکن اس کی صراحت نہیں؛ البتہ اس میں تعظیم زیادہ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدرالمدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے لیے صیغۂ جمع استعمال فرماتے تھے، مثلاً: ''اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں۔'' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرماتے تھے، کہ مجھے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے صیغۂ جمع کے استعمال کی عادت ہوگئی ہے۔ ویسے جائز دونوں ہیں، مگر میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا، کیوں کہ ممکن ہے، کہ اپنے استاذ کی محبت کی وجہ سے صیغۂ جمع کو پسند کرتا ہوں۔

مسئلۂ میزان ووزنِ اعمال

﴿الموازین﴾.

ایمان بالمیزان ووزنِ اعمال پر ابن بطال مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ سنت کا اجماع نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح الباری'' میں نقل فرمایا ہے، کہ ابواسحاق زَجّاج نے یہ اجماع نقل کیا ہے، لیکن یہ حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ کا وہم ہے۔ صحیح بات یہ ہے، کہ ابن بطال نے اجماع نقل کیا ہے، نہ کہ ابواسحاق زَجّاج نے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن بطال کے کلام کو پڑھتے ہوئے چوں کہ آغاز ابواسحاق زَجّاج کے کلام سے ہوا تھا، یہ سمجھ لیا کہ اجماع والی بات بھی انہی کی ہے، حالاں کہ ایسا نہیں، وہ خود ابن بطال کا کلام ہے۔ حافظ الدنیا، جبل العلم حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قسم کے اوہام کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ''مِن کمالِ المرءِ اَنْ تُعدَ سَقْطاته''.

قدریہ، بعض جہمیہ اور قدماءِ معتزلہ میں سے ایک قوم نے وزنِ اعمال کا انکار کیا ہے۔ معتزلہ کے تئیس فرقے ہیں۔ "اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین" للرازی میں سترہ، "الملل والنِّحل" للشہرستانی میں مزید دو اور "الفرَق بین الفِرَق" للبغدادی میں مزید چار فرقوں کا ذکر ہے، اس طرح مجموعہ تئیس ہوا۔ وزنِ اعمال کے منکر معتزلہ کو "وزنیہ" کہا جاتا ہے۔

ان میں سے علاّف معتزلی اور بشر بن المعتمر معتزلی جیسے بعض نے وزنِ اعمال کو عقلاً ممکن قرار دیا ہے، لیکن اس کے ثبوت و وقوع کا انکار کیا ہے۔

اور دوسروں نے اس کو محال قرار دیا ہے، اس لیے کہ:

(۱)... اعمال اعراض ہیں۔ اور ان کا حال یہ ہے، کہ ادھر صدور ہوا اور ادھر ختم۔ فوراً فنا اور معدوم ہوجاتے ہیں۔ موجود اور باقی نہیں رہتے۔ اور ان کا اعادہ ناممکن ہے۔

(۲)... اگر اعمال کا بقاء تسلیم کرلیں، یا ان کے اعادہ کو ممکن مان لیں، تو اعراض ہونے کی وجہ سے ان کا وزن نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اعراض کا وزن ممتنع ہے، اس لیے کہ اعراض کو ثقل یا خفّت کے ساتھ متصف نہیں کرسکتے۔

(۳)... اگر اعمال کے وزن کے ممکن ہونے کو تسلیم بھی کرلیں، تو وزن کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے کہ وزن سے مقصود تفاوتِ اعمال کا علم ہے، اور اللہ تعالیٰ تو تفاوتِ اعمال سے باخبر ہیں، اور جس میں فائدہ نہ ہو، اس کا انجام دینا قبیح ہے، اور اللہ تعالیٰ فعلِ قبیح سے منزہ ہے۔

ازالۂ وہم

یہاں ایک تنبیہ ضروری معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ بعض حضرات خیال کرتے ہیں، کہ ہمارے زمانے میں نہ قدریہ ہیں، نہ جہمیہ اور نہ ہی معتزلہ۔ تو پھر ان کے دلائل کا نقل ورد کیا معنی رکھتے ہیں؟ یہ تو بے سود ہے، گڑے مردے اکھاڑنا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے، کہ اولاً: علومِ دینیہ کے ہر طالب علم کے لیے اسلام کے معارض نظریات سے باخبر رہنا ضروری ہے، خواہ وہ نظریات قدیم ہوں یا جدید۔

اور ثانیاً: یہ بات تو صحیح ہے، کہ معتزلہ، قدریہ اور جہمیہ جیسے گمراہ اور باطل فرقے ان مخصوص ناموں کے ساتھ غالباً اب صفحۂ ہستی پر کہیں نہیں پائے جاتے، مگر یہ یاد رہے، کہ عامتاً نظریات ایک بار پیدا ہوکر ختم نہیں ہوتے؛ بلکہ ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں، بنیادی خیالات اپنی جگہ برقرار

رہتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا، کہ چند سال پہلے یہیں برطانیہ میں عذابِ قبر کے انکار کی صدائے بازگشت سنائی دی تھی۔ لہٰذا ممکن ہے، اور بسا ممکن ہے، کہ ان گمراہ فرقوں کے نظریات ومعتقدات اِس وقت بھی کسی فرقے میں پائے جاتے ہوں، جس کی کسی اور نام سے اپنی شناخت و پہچان ہو۔ ضروری نہیں، کہ دورِاوّل کے اصل فرقۂ معتزلہ یا قدریہ یا جہمیہ کی ساری ہی خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہوں، اور وہ سارے معتقدات آج بھی اسی طرح بلاکم وکاست پائے جاتے ہوں؛ بلکہ مرورِ زمانہ کی وجہ سے ان قدیم اور اصل فرقوں کے افکار ونظریات اور عقائد میں کمی بیشی ہونا لازمی ہے۔ لہٰذا اس زمانے میں بھی اُن فرقِ باطلہ کے دلائل اور ان کے جوابات سے واقفیت نہ صرف یہ کہ بے سود نہیں؛ بلکہ لازم اور ضروری ہے۔

منکرینِ وزنِ اعمال کے وجوہِ انکار کی خشتِ اوّل

قبل اس کے کہ ان کے ''اگر مگر'' کا تجزیہ کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ وجوہِ انکار کی خشتِ اوّل کے متعلق ایک آدھ بات عرض کردی جائے۔ ان کے ''اگر مگر'' کی بنیادی وجہ ان کا نظریۂ عقلی استبداد اور جہاں عقل کام نہیں دے سکتی، وہاں اس سے کام لینا ہے، حالاں کہ عقل کی بھی ایک حد ہے۔ دیکھیے! آنکھ کی ایک قوت ہے، اور اس کی ایک حد ہے، اس سے آگے دوربین لگانے کی ضرورت ہے۔ پیروں کی ایک قوت ہے، جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہاتھ، کان وغیرہ کا حال ہے۔ تو جب ہر قوت محدود ہے، تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عقل کے متعلق بہت خوب مثال دی ہے، فرماتے ہیں: عقل ایسی ہے، جیسے پہاڑ پر چڑھنے والے کے لیے گھوڑا۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہوکر پہاڑ تک پہنچے، اور پھر پہاڑ پر بھی اسی پر سوار ہوکر چڑھنے لگے، یہ غلطی پر ہیں۔ ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے۔ دوسرے وہ ہیں، جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں، تو اس سے عام راستہ پر بھی، ہموار سڑک پر بھی کام لینے کی ضرورت نہیں، وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہنچ کر تھک گئے، یہ بھی پہاڑ پر نہ چڑھ سکے۔ تو ان دونوں کی رائے وروش غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا، کہ اخیر تک اُسی سے راستہ طے کرنا چاہا۔ اور دوسری جماعت نے ایسا بےکار سمجھا، کہ پہاڑ تک بھی اُس سے کام

نہ لیا۔ تیسری جماعت نے پہاڑ تک گھوڑے پر سواری کی، پھر پہاڑ پر چڑھنے کے لیے کوئی اور انتظام کیا۔ انھوں نے یہ خیال کیا، کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لیے بے کار، اس کے لیے کسی اور انتظام کی ضرورت ہے۔ یہی سوچ اور طرزِ عمل صحیح ہے۔

ٹھیک یہی حال عقل کا ہے، کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے، اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔ ”حجة الله البالغة“ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بحث کی ہے، کہ عقل کے مطابق کہاں تک چلا جاسکتا ہے۔ بس عقل سے اتنا کام لینا چاہیے، کہ آدمی توحید ورسالت کو سمجھے، اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کرلے، اس سے آگے عقل سے کام نہ لینا چاہیے؛ بلکہ اب اللہ تعالیٰ اور اس کے سچے رسول ﷺ کے آگے گردن جھکا دینی چاہیے۔ اب آگے وحی سے کام لینا چاہیے۔ شیخ ابوطاہر قزوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ عقل سے آخرت کے امور نہیں؛ بلکہ دارِ تکلیف میں اوامر ونواہی کی تفاصیل اور مصالح ومفاسدِ معاش کو معلوم کیا جاسکتا ہے اور بس۔

الغرض شریعت میں تفریطِ عقل سے کام نہیں چلتا، نہ افراط سے کام چلتا ہے؛ بلکہ توسط کی ضرورت ہے، جس کا نام ”حکمت“ ہے۔ تفریط فی العقل اگر مذموم ہے، تو افراط فی العقل بھی نہایت مضر ہے۔ اطبّاء نے بھی اس کو امراض میں سے شمار کیا ہے، کیوں کہ افراطِ عقل کا نتیجہ اوہام وشکوک میں ابتلاء ہے، جس سے قلب ودماغ دونوں ضعیف ہوجاتے ہیں، اسی لیے کہنے والے نے کیا خوب کہا ؎

آزمودم عقلِ دور اندیش را ✿ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

میں نے دور اندیش عقل کو آزمایا۔ بارہا ایسا ہوا، کہ عقل نے کسی فکر وخیال کو جنم دیا، کوئی رائے وراہ سُجھائی، اس وقت تو ایسا محسوس ہوا، کہ عقل نے بڑی دور کی سوچی، اور اپنے دور اندیش ہونے کا ثبوت دیا، لیکن آنے والے وقت نے بتایا، کہ اس نے کیا کیا گل کھلائے۔ اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو دیوانہ بنایا، یعنی بلا چوں وچرا اتباع اور کامل اطاعت اختیار کی۔

”فتح البیان“ میں کیا خوب لکھا ہے، کہ جنھوں نے میزان کا اس لیے انکار کیا، کہ ان کی عقول نے اس کو قبول نہیں کیا، تو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی قوم کی عقول نے اس کو قبول کیا ہے، جن کی عقلیں ان انکار کرنے والوں کی عقلوں سے زیادہ قوی تھیں، یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور اتباعِ تابعین رحمہم اللہ۔

منکرینِ وزن کے دلائل کے جوابات

اب ہم وزنِ اعمال کے منکرین کے دلائل کے تجزیے اور رد کی طرف آتے ہیں۔

منکرین میں سے بعض نے وزنِ اعمال کو عقلاً ممکن ماننے کے بعد اسکے وقوع کا انکار کیا ہے۔ اسکے متعلق تو یہی کہا جائیگا، کہ جب وزنِ اعمال ممکن چیز ہے، اور اللہ تعالیٰ شانہ اور اسکے رسول ﷺ جیسے مخبرِ صادق نے اسکے وقوع کی خبر دی ہے، پھر تو لاریب اس کی تصدیق ضروری ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہوسکتی ہے؟ ﴿ومن اصدق من اللہ قیلا﴾. (النساء:۱۲۲) ﴿ومن اصدق من اللہ حدیثا﴾. (النساء:۸۷) اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق خود حق تعالیٰ شانہ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وما ینطق عن الھوی. ان ھو الا وحی یوحی﴾. (النجم:٤)

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ❁ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود
مصطفیٰ ہرگز نہ گفتے، تا نہ گفتے جبرئیل ❁ جبرئیل ہرگز نہ گفتے، تا نہ گفتے کردِگار

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے وقوعِ وزن کی خبر دینے کے بعد اس کا انکار سوائے ضلالت اور گمراہی کے کچھ نہیں۔

منکرین کی دوسری جماعت وزنِ اعمال کو محال قرار دیتی ہے، اس لیے کہ یہ اعراض ہیں، اور باقی نہیں رہتے ہیں۔ اس کے دو جواب ہیں:

(۱)... پہلا جواب یہ ہے، کہ اعمال کیلئے بقاء نہ ہونے کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے سائنس دانوں کی نئی تحقیق کا "فیض الباری" میں ذکر فرمایا ہے، کہ "ابتداءِ زمان سے جتنی آوازیں صادر ہوئیں، نکلیں، وہ سب فضاء میں موجود ہیں، ان میں سے کوئی بھی آواز فناء اور معدوم نہیں ہوئی۔" اس سے زبان کے عمل کا بقاء ثابت ہوا، تو یہ دعویٰ ٹوٹ گیا، کہ اعمال کیلئے بقاء نہیں، اس لیے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہے۔ اور قرآن مجید نے تو زبان کی قید کے بغیر مطلقاً اعمال کو باقی قرار دیا ہے، ارشاد ہے: ﴿والبٰقیٰت الصٰلحٰت خیر عند ربك ثوابا و خیر املا﴾. (الکھف:٤٦) "اور جو اعمالِ صالحہ باقی رہنے والے ہیں، وہ آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہے اور امید کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہے۔"

(۲)... دوسرا جواب صوفیہ کے اصول پر ہے، کہ اگر کوئی چیز فنا ہوتی ہے، تو اس جیسی چیز تجدّدِ امثال کے طور پر موجود رہتی ہے۔ اور جب اس جیسی چیز موجود ہے، تو اس مثل کے وزن سے خود

اُس چیز کا وزن معلوم ہوسکتا ہے۔

وزنِ اعمال کومحال قرار دینے والوں نے کہا تھا، کہ اعمال کا بقاء یا امکانِ اعادہ تسلیم کرنے کی صورت میں وزن نہ ہوسکنا اس لیے ہے، کہ اعمال اعراض ہیں، اوراعراض کا وزن نہیں ہوسکتا۔ اس کے چند جوابات ہیں:

(۱) ممکن ہے، صحائف اعمال کو جواز قبیلِ جواہر ہیں، وزن کیا جائے۔

(۲) ممکن ہے، اعمال کو اجسام میں رکھا جائے، پھران اجسام کا وزن کیا جائے۔ چناں چہ بعض علماء فرماتے ہیں، کہ مطیعین کے اعمال کو اچھی صورت میں اور مسیئین کے اعمال کو قبیح صورت میں رکھا جائے گا، پھروزن کیا جائے گا۔

(۳) شیخ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ ''عالم تین ہیں: عالمِ دنیا، عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت۔ ان میں سے ایک عالم کا دوسرے عالم پر قیاس ہی بیجا ہے، کیوں کہ ہر عالم کے نوامیس وقوانین اور حالات جدا ہیں۔'' بلکہ دارِ دنیا ہی میں اقالیم کے بدلنے سے حالات بدل جاتے ہیں مثلاً یہاں اس وقت دن ہے، انڈیا میں رات ہے۔ یہاں سردی ہے، سعودیہ میں گرمی ہے۔ یہاں چوبیس گھنٹے کے دن ورات ہیں، فن لینڈ، سویڈن اور ناروے کے بعض علاقوں میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے۔ لہٰذا دارِ دنیا میں اگر اعراض کا وزن نہ ہوسکتا ہو، تو اس سے یہ کہاں لازم آیا، کہ دارِ آخرت میں بھی ان کا وزن نہیں ہوسکے گا۔ ممکن ہے جو چیز یہاں عرض ہو، اُس عالم میں جا کر جوہر ہوجائے۔ ایک آن اور ایک محل میں شئے واحد عرض وجوہر نہیں ہوسکتی، مگر یہ تو ہوسکتا ہے، کہ ایک شئے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جوہر ہوجائے۔ اس کے ممتنع ومحال ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔

تقریب الی الفہم کے لیے معقولی مثال سے اس طرح وضاحت کی جاسکتی ہے، کہ آدمی کے ذہن میں مثلاً پہاڑ کا تصور آیا، پہاڑ جوہر ہے، لیکن ذہن میں اس کی جو صورت حاصل ہوئی، پائی گئی، یہ عرض ہے۔ تو جو نسبت ذہن کو خارج سے ہے، ہم کہتے ہیں، کہ وہی نسبت دنیا کو آخرت سے ہے۔ جس طرح اَعراضِ ذہنیہ خارج میں جواہر ہیں، اسی طرح اعراضِ دنیویہ آخرت میں جواہر ہوں تو کیا اشکال ہے؟

صحیح مسلم وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے، کہ ''قیامت کے دن سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران اس طرح آئیں گی، گویا کہ یہ دو بادل ہیں، یا دو سائبان ہیں، یا پَر پھیلائے ہوئے

پرندوں کی دوڈاریں ہیں۔'' دیکھئے! سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران جوہر کی صورت اختیار کرلیں گی۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہ اعمال کو جسم عطا کردیا جائے گا۔

علامہ جلال الدین دوانی معقولی رسالۂ ''زوراء'' میں فرماتے ہیں، کہ جو اعمال ہم کرتے ہیں، وہ یہاں اعراض ہیں، مگر عالمِ آخرت میں جواہر ہوں گے۔اوران کے لیے یہ صورتِ جوہریہ اعمال کے صدور ہی کے وقت سے حاصل ہوجاتی ہے۔

جب اعمال اُس عالم میں اعراض نہ رہیں گے؛ بلکہ جوہر ہوجائیں گے، تو پھر اُن کے وزن میں کیا اشکال ہوسکتا ہے؟

(۴) چوتھا جواب یہ ہے، کہ کوئی زمانہ گذرا ہے، جس میں دنیا میں اعراض کا وزن نہیں ہوتا تھا، یا اعراض کا وزن خلافِ عادت قرار دیا جاتا تھا، خلافِ عقل نہیں، آج کے زمانے میں تو اعراض کا وزن خلافِ عادت بھی نہیں رہا، کیوں کہ اعراض کا وزن ہورہا ہے اور خوب ہورہا ہے۔ پہلے حکماء حرارت و برودت کو مقولۂ کیف سے سمجھتے تھے، جس کے لیے وزن اور مقدار نہیں ہوسکتی، مگر آج کے زمانے میں بعض آلات کے ذریعے سے ان کا وزن کیا جاتا ہے کہ اس مکان میں کتنے درجہ کی حرارت ہے اور کتنے درجہ کی برودت ہے۔ بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے، آواز کی رفتار ناپی جاتی ہے۔ بجلی کا وزن ہوتا ہے، ہر تین مہینے میں آنے والا بجلی کا بل بتاتا ہے، کہ کتنے یونٹ بجلی استعمال کی ہے۔

وزنِ اعمال کو محال قرار دینے والوں نے کہا تھا، کہ اگر وزنِ اعمال کو ممکن تسلیم بھی کرلیں، تو یہ بے سود وعبث ہے، کیوں کہ وزن سے مقصود تفاوتِ اعمال کا علم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تو تفاوتِ اعمال معلوم ہے، اور بے فائدہ وعبث کا انجام دینا قبیح ہے، اور اللہ تعالیٰ قبیح سے منزہ ومبرّا ہے۔

اس کا جواب اولاً تو یہ ہے، کہ ﴿لا یسئل عما یفعل وهم یسئلون﴾. (الانبیاء:۲۳)
''وہ جو کچھ کرتا ہے، اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا اور اوروں سے باز پرس کی جاسکتی ہے۔''

اور ثانیاً یہ ہے، کہ وزنِ اعمال عبث نہیں ہے، کیوں کہ وزن اعمال سے مقصود یہ نہیں، کہ اللہ تعالیٰ وزن سے بندوں کے تفاوتِ اعمال پر مطلع ہوں، العیاذُ باللّٰه. وہ تو عالِمُ الغیبِ والشهادة ہیں۔ علیمٌ بذات الصدور ہیں، ہر شخص کے قول وفعل سے بخوبی واقف ہیں۔ حافظ ابن ناصر الدین دِمَشقی رحمۃ اللہ علیہ نے ''منهاج الاستقامة'' میں اس کی پانچ وجوہ ذکر کی ہیں۔ دوسرے علماء بھی کچھ وجوہ بیان کی ہیں۔ یہاں چند ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) وزنِ اعمال سے مقصود اتمامِ حجت ہے۔ (۲) علامتِ سعادت وشقاوت کا اظہار ہے۔(۳) دنیا میں اس کے ذریعے مکلّفین کا امتحان مقصود ہے، کہ میزان ووزنِ اعمال پر ایمان لاتے ہیں یا نہیں؟ (۴) جو مخلوط عمل والے ہیں، جن کے نیک و بد اعمال ملے جلے ہیں، ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ اگر عفو کا معاملہ فرمائیں، تو وہ جان لیں، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ فضل کا برتاوٴ فرمایا ہے۔ اور اگر عقاب دیں، تو ان کو یقین ہوجائے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ عدل کا معاملہ فرمایا ہے مختصر لفظوں میں کہیں، تو وزنِ اعمال سے مقصود اظہارِ عدل وفضل ہے۔ (۵) متقی کے اعمال کا وزن ہوگا، تاکہ لوگوں کے سامنے اس کا فضل ظاہر ہو۔ اور کافر کے اعمال کا وزن ہوگا، تاکہ لوگوں کے سامنے اس کی ذلت وخواری اور رسوائی ہو۔ (۶) حسنات والے پلڑے کے جھکنے کی صورت میں آدمی کی مسرت وفرحت میں اضافہ ہو، اور برعکس صورت میں رنج وغم میں اضافہ کا باعث ہو۔

اہل سنت کے دلائل

فِرقِ باطلہ کے دلائل اور ان کے جوابات کے بعد اب ہم اہلِ سنت والجماعۃ کے دلائل کی طرف آتے ہیں۔ اہل سنت کے دلائل کئی ایک ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿والوزن يومئذن الحق فمن ثقلت موازينه فاولئك هم المفلحون ومن خفت موازينه فاولئك الذين خسروا انفسهم بما كانوا بآيتنا يظلمون﴾. (الأعراف:۸-۹) ”اور اس روز وزن واقع ہونے والا ہے۔ پھر جس شخص کا پلڑا بھاری ہوگا، سو ایسے لوگ کامیاب ہوں گے۔ اور جس شخص کا پلڑا ہلکا ہوگا، سو یہ وہ لوگ ہوں گے، جنھوں نے ہماری آیتوں کی حق تلفی کرنے کی وجہ سے اپنا نقصان کرلیا۔“

(۲) سورۃ المومنون میں ارشاد ہے: ﴿فمن ثقلت موازينه فاولئك هم المفلحون ومن خفت موازينه فاولئك الذين خسروا انفسهم فى جهنم خلدون﴾. (المؤمنون: ۱۰۲-۱۰۳) ”سو جس شخص کا پلڑا بھاری ہوگا، تو ایسے لوگ کامیاب ہوں گے۔ اور جس شخص کا پلڑا ہلکا ہوگا، سو یہ وہ لوگ ہوں گے، جنھوں نے اپنا نقصان کرلیا اور جہنم میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے۔“

(۳) سورۃ القارعۃ میں ہے: ﴿فاما من ثقلت موازينه فهو فى عيشة راضية واما من خفت موازينه فامه هاوية﴾. (القارعة: ٦ الى ٩) ”پھر جس شخص کا پلڑا بھاری ہوگا، وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا۔ اور جس شخص کا پلڑا ہلکا ہوگا، اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا۔“

(۴) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی باب میں ذکر کردہ آیتِ قرآنیہ: ﴿ونضع الموازين القسط ليوم القيامة فلا تظلم نفس شيئا وان كان مثقال حبة من خردل اتينا بها وكفٰى بنا حٰسبين﴾. (الانبياء: ٤٧) ''اور قیامت کے روز ہم میزانِ عدل قائم کریں گے، سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا۔ اور اگر عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا، تو ہم اس کو حاضر کردیں گے۔ اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔''

(۵) صحیح ابن خزیمہ میں سلیمان تیمی رحمہٗ اللہ کے طریق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی امّ السُّنّۃ: حدیث جبریل میں ''ما الایمان؟'' کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور کتب ورُسل وغیرہ پر ایمان لانے کو بیان فرمایا ہے، وہیں ایمان بالمیزان کا ذکر بھی فرمایا ہے۔

(۶) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی باب کے ذیل میں ذکر کردہ حدیثِ پاک: كلمتان حبيبتان الى الرحمن، خفيفتان على اللسان، ثقيلتان فى الميزان: سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم. ''دو کلمے رحمٰن کو نہایت محبوب ہیں، زبان پر نہایت ہلکے پھلکے ہیں، میزان میں بڑے وزن دار ہیں: سبحان الله وبحمده: سبحان الله العظيم.

وزنِ اعمال کے منکرین نے ان جیسی نصوص میں وارد میزان وموازین کے الفاظ میں تاویل کی، اور کہا، کہ اس سے مراد عدل وانصاف ہے، کہ اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کی ایسی رعایت کریں گے، کہ اس میں ذرہ برابر تفاوت واقع نہ ہوگا۔ میزان وموازین سے وزن کا آلہ مراد نہیں ہے۔

اہلِ سنت والجماعۃ فرماتے ہیں، کہ میزان وموازین کے معنیٔ حقیقی وزن کا آلہ ہے، اور اس سے محض دل وانصاف مراد لینا معنیٔ مجازی ہے، اور بلاضرورت حقیقت کو ترک کرنا اور مجاز کی طرف جانا جائز نہیں، خصوصاً جبکہ اس سلسلے میں اسانید صحیحہ کے ساتھ احادیث کثیرہ منقول ہیں۔

آمدی رحمۃ اللہ علیہ نے ان متأولین کا رد کرتے ہوئے فرمایا: کہ نصوص میں موازین ثقل وخفت کے ساتھ موصوف ہے، جبکہ عدل وانصاف کو ثقل خفت کے ساتھ متّصف نہیں کیا جاتا، اس لیے میزان وموازین کی تاویل عدل وانصاف سے صحیح نہیں ہے۔

میزان پیدا شدہ ہے؟

میزان پیدا شدہ ہے، بنادی گئی ہے، یا آئندہ بنائی جائے گی؟ نظمِ قرآنی ﴿ونضع

الموازین﴾ سے کوئی بات نکلتی نہیں ہے، کیوں کہ "ونضع" کے معنی ہیں: ونحضِرها، "ہم حاضر کریں گے"۔ ونُقیمُها، "ہم قائم کریں گے۔"

سلیمان جمل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ میزان کون سے جوہر و مادہ کی ہے، اور یہ کہ میزان فی الحال موجود ہے یا آئندہ وجود میں آئے گی؟ ان امور کی تعیین سے ہم رکتے ہیں۔

شیخ ناصرالدین لقانی مالکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ میزان کس مادہ و مٹیریل کی ہوگی، اس سلسلے کی کسی نص پر جیسے میں واقف نہیں ہوسکا ہوں، اسی طرح ایسی کوئی نص پر بھی میں واقف نہیں ہوسکا ہوں، جو اس بات پر دلالت کرے، کہ میزان بنائی اور پیدا کی جاچکی ہے، یا آئندہ بنائی جائے گی۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ اس سلسلے میں ایک روایت ہے، جو اس بات میں نص ہے، کہ میزان بن چکی ہے، لیکن اس روایت کا حال مجھے معلوم نہیں، کہ وہ کس درجے کی ہے؟ لہٰذا روایت قابلِ تحقیق ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ:

حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی، کہ مجھے میزان دکھائیے۔ اللہ تعالیٰ نے میزان دکھائی۔ تفسیر بغوی اور خازن وغیرہ میں مذکور روایت کے اضافہ کے مطابق اس کا ہر پلڑا مشرق و مغرب کو محیط تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام میزان دیکھ کر بے ہوش ہوگئے۔ جب افاقہ ہوا، تو عرض کیا: بارِ الٰہا! کون شخص اس کے پلڑے کو نیکیوں سے پُر کر سکے گا؟

یہاں ایک لمحہ رک کر یہ سوچیے، کہ یہ سوال کون کررہے ہیں؟ حضرت داؤد علیہ السلام کررہے ہیں، جن کو اللہ نے "خلیفة في الأرض" قرار دیا۔ ایک طرف پیغمبرانہ تقویٰ و تقدس، دوسری طرف عبادت کا یہ حال کہ حدیثِ صحیح کی تصریح کے مطابق روزانہ ان کی تہائی رات عبادت میں صرف ہوتی تھی، اور ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کرتے تھے، دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت پشت نہیں دکھاتے تھے۔ ان سب کے باوجود میزان کو دیکھ کر ہول و دہشت کی وجہ سے طاری ہونے والی بے ہوشی کے بعد یہ سوال کہ الٰهی! من الذی یقدر علی ان یملأ کِفّته حسنات؟ "اس کے پلڑے کو نیکیوں سے کون پُر کر سکے گا؟" اپنے اندر بڑا سبق اور معنی رکھتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے سوال پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یا داود، انی اذا رضیت عن عبدی ملأتها بتمرة. "اے داود! جب میں اپنے کسی بندے سے راضی ہوں گا، تو اس کو ایک کھجور سے بھردوں گا، پُر کردوں گا۔"

امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ”المُصَنَّف“ میں ثقہ رُواۃ سے روایت نقل کی ہے، جس کو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ”کتاب الزهد“ میں ذکر کیا ہے، کہ ایک راہب اپنے گرجا میں ساٹھ سال سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کررہا تھا۔ علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ”الیواقیت والجواھر“ میں پانچ سو سال نقل کیا ہے، لیکن انھوں نے اس کو بلاسند کے ذکر کیا ہے۔ ایک مرتبہ بارش کے زمانے کے بعد اس نے اپنے گرجا سے نیچے دیکھا، تو جگہ جگہ پانی سے بھرے تالاب اور سبزہ نظر پڑا۔ خوش نما منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ گرجا سے اترا، اور چہل قدمی کرنے لگا۔ وہاں ایک خاتون مل گئی، اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا، آخرش اس سے منھ کالا کیا۔ اس راہب کے پاس ایک تھیلی تھی، جس میں ایک روٹی تھی۔ اس کو ایک جگہ رکھ کر غسل کرنے کے لیے پانی میں اترا۔ ادھر اس کی موت کا وقت آگیا۔ ایک سائل وہاں سے گذرا۔ راہب نے سائل کو روٹی کی طرف اشارہ کیا۔ سائل نے روٹی لے لی، پھر راہب کا انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے ساٹھ سالہ اعمال کا وزن کیا گیا، تو ساٹھ سال کی عبادت کے مقابلے میں زنا والا پلڑا بھاری ہوگیا۔ اس کے بعد جاں کنی سے پہلے سائل کو صدقہ کی ہوئی روٹی کو نیکیوں والے پلڑے میں رکھا گیا، تو نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگیا، اور اس کی معافی ہوگئی۔

یہاں یہ یاد رہے، کہ وزنِ اعمال تو روزِ محشر میں ہوگا، لیکن محقق الوقوع امور کے لیے روایات میں بعض مرتبہ ماضی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے، وہی اسلوب اِس روایت میں اختیار کیا گیا ہے۔

امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ”التحبیر فی التذکیر“ میں نقل کیا ہے، کہ ایک آدمی کا انتقال ہوا۔ بعد میں کسی نے اس کو خواب میں دیکھا، پوچھا: اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ کہا: میری نیکیاں اور بدیاں وزن کی گئیں، تو بدیاں نیکیوں پر غالب آئیں، بدیوں والا پلڑا بھاری ہوگیا، پھر اوپر کی جانب سے ایک تھیلی آئی، اور نیکیوں والے پلڑے میں گری، تو نیکیوں والا پلڑا وزنی ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے تھیلی کھولی، تو اس میں وہ مٹھی بھر مٹی تھی، جو میں نے ایک مسلمان آدمی کی تدفین کے وقت اس کی قبر پر ڈالی تھی۔ یہ واقعہ استیناس کے لیے ذکر کیا ہے۔

دیکھیے! یہ کوئی عام حکم نہیں ہے، کہ انسان زندگی بھر کبائر کا ارتکاب کرتا رہے۔ پھر جاں کنی سے پہلے پہلے ایک روٹی کا صدقہ کردے، اور استیناس والے واقعہ میں کسی مسلمان کی تدفین کے وقت قبر پر کچھ مٹی ڈال دے، اور یہ سمجھے کہ یہ روٹی کا صدقہ یا قبر پر مٹی ڈالنا اس کے تمام کبائر کے

لیے مکفّر بن جائے گا؛ بلکہ بات وہی ہے، جو پہلی روایت میں آئی، کہ اللہ تعالیٰ جب کسی سے راضی ہوجائیں، تو ایک کھجور سے نیکیوں والا پلڑا اُپر کردیں۔ ساٹھ سالہ عبادت پر غالب آنے والے زنا کے گناہ پر ایک روٹی کو وزنی کردے۔ کونسا عمل کس قدر خلوص والا ہے، اور کس قدر وزن والا ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

بہرحال حضرت داود علیہ السلام والی روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ میزان پیدا کردی گئی ہے۔

بندہ نے ایک حدتک اس روایت کی سند کا اس کے مظان میں تتبع کیا، لیکن اسمیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

میزان حساب سے پہلے قائم کی جائے گی یا حساب کے بعد؟

میزان حساب سے پہلے قائم کی جائے گی یا حساب کے بعد؟ بالفاظِ دیگر حساب پہلے ہوگا، یا وزن پہلے ہوگا؟ اس سلسلے میں دو رائیں ہیں:

(۱) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ، امام عبداللہ القرطبی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ شہاب رملی رحمۃ اللہ علیہ اور صاحب کنز الاسرار وغیرہ جمہور علماء کی رائے یہ ہے، کہ پہلے حساب ہوگا، پھر وزن ہوگا، کیوں کہ وزن جزاء کے لیے ہے، تو مناسب ہے، کہ محاسبہ کے بعد ہو، اس لیے کہ حساب میں تقریر ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنے سامنے کھڑا کرکے ان کے اعمال پر تفصیلاً واقف کریں گے، پھر اعمال کی مقادیر کے اظہار کے لیے میزان قائم کی جائے گی، کہ حسنات اتنی مقدار کی ہے، اور سیئات اتنی مقدار کی ہے۔

(۲) علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ آیتِ قرآنیہ ﴿ونضع الموازين القسط...﴾ میں پہلے وضعِ موازین کا ذکر ہے، اس کے بعد اختتامِ آیت پر آرہا ہے: ﴿وكفى بنا حٰسبين﴾. اس میں کچھ اشارہ ہے، کہ پہلے وزن ہوگا، پھر حساب ہوگا۔ ویسے واو مطلق جمع کے لیے آتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ ترتیب ذکری کا بھی کسی درجہ میں اعتبار ہو، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات بیان فرمائی ہو۔

❁ ❁ ❁

استخارہ سنت کے مطابق کیجیے

از: محمد عمر انور
استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

خیر اور بھلائی طلب کرنا

استخارہ کا مطلب ہے کسی معاملے میں خیر اور بھلائی کا طلب کرنا، یعنی روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے اپنے ہر جائز کام میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور اللہ سے اس کام میں خیر، بھلائی اور رہنمائی طلب کرنا، استخارہ کے عمل کو یہ سمجھنا کہ اس سے کوئی خبر مل جاتی ہے تو یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جس کی وجہ سے کئی غلط فہمیوں نے جنم لیا جن کا تفصیل سے تذکرہ آگے آرہا ہے، استخارہ ایک مسنون عمل ہے، جس کا طریقہ اور دعا نبی ﷺ سے احادیث میں منقول ہے، حضور اکرم ﷺ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہر کام سے پہلے اہمیت کے ساتھ استخارے کی تعلیم دیا کرتے تھے، حدیث کے الفاظ پر غور فرمایئے حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

اذا هم احدكم بالامر فليركع ركعتين من غير الفريضة [بخاری]

ترجمہ: جب تم میں سے کوئی شخص کسی بھی کام کا ارادہ کرے تو اس کو چاہیے کہ فرض نماز کے علاوہ دو رکعت نفل پڑھے۔

استخارہ حدیث نبوی کی روشنی میں

۱- عن جابر بن عبد الله رضى الله تعالى عنه قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعلمنا الاستخارة فى الامور كلها كما يعلمنا سورة من القرآن [ترمذی]

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی

اللہ تعالیٰ عنہم کو تمام کاموں میں استخارہ اتنی اہمیت سے سکھاتے تھے جیسے قرآن مجید کی سورت کی تعلیم دیتے تھے۔

استخارہ نہ کرنا محرومی اور بدنصیبی ہے

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

۲-من شقوة ابن آدم تركه استخارة اللّٰه [مجمع الاسانيد]

یعنی اللہ تعالیٰ سے استخارہ کا چھوڑ دینا اور نہ کرنا انسان کے لیے بدبختی اور بدنصیبی میں شمار ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادگرامی ہے:

۳- عن سعد بن وقاص عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: من سعادة ابن ادم استخارته من الله و من شقاوته ترك الاستخارة و من سعادة ابن اٰدم رضاه بما قضاه الله ومن شقوة ابن اٰدم سخطه بما قضى الله.[مشكوة]

ترجمہ: انسان کی سعادت اور نیک بختی یہ ہے کہ اپنے کاموں میں استخارہ کرے اور بدنصیبی یہ ہے کہ استخارہ کو چھوڑ بیٹھے، اور انسان کی خوش نصیبی اس میں ہے کہ اس کے بارے میں کیے گئے اللہ کے ہر فیصلے پر راضی رہے اور بدبختی یہ ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کرے۔

استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہوگا

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

٤- ما خاب من استخار وما ندم من استشار [طبرانی]

یعنی جو آدمی اپنے معاملات میں استخارہ کرتا ہو وہ کبھی ناکام نہیں ہوگا اور جو شخص اپنے کاموں میں مشورہ کرتا ہو اس کو کبھی شرمندگی یا پچھتاوے کا سامنا نہ کرنا پڑے گا کہ میں نے یہ کام کیوں کیا؟ یا میں نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟، اس لیے کہ جو کام کیا وہ مشورہ کے بعد کیا اور اگر نہیں کیا تو مشورہ کے بعد نہیں کیا، اس وجہ سے وہ شرمندہ نہیں ہوگا۔

اس حدیث میں جو یہ فرمایا کہ استخارہ کرنے والا ناکام نہیں ہوگا، مطلب اس کا یہ کہ انجام

کے اعتبار سے استخارہ کرنے والے کو ضرور کامیابی ہوگی، چاہے کسی موقع پر اس کے دل میں یہ خیال بھی آجائے کہ جو کام ہوا وہ اچھا نہیں ہوا، لیکن اس خیال کے آنے کے باوجود کامیابی اسی شخص کو ہوگی جو اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا رہے، اسی طرح جو شخص مشورہ کرکے کام کرے گا وہ کبھی پچھتائے گا نہیں، اس لیے کہ خدانخواستہ اگر وہ کام خراب بھی ہوگیا تو اس کے دل میں اس بات کی تسلی ہوگی کہ میں نے یہ کام اپنی خودرائی اور اپنے بل بوتے پر نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دوستوں اور بڑوں سے مشورہ کے بعد کیا تھا، اب آگے اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے کہ وہ جیسا چاہیں فیصلہ فرمادیں۔ اس لیے آپ ﷺ نے دو باتوں کا مشورہ دیا ہے کہ جب بھی کسی کام میں کشمکش ہو تو دو کام کرلیا کرو، ایک استخارہ اور دوسرے استشارہ یعنی مشورہ۔

استخارہ کا مقصد

محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

''واضح ہو کہ استخارۂ مسنونہ کا مقصد یہ ہے کہ بندے کے ذمے جو کام تھا وہ اس نے کرلیا اور اپنے آپ کو حق تعالیٰ کے علم محیط اور قدرت کاملہ کے حوالہ کردیا، گویا استخارہ کرنے سے بندہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوگیا، ظاہر ہے کہ اگر کوئی انسان کسی تجربہ کار عاقل اور شریف شخص سے مشورہ کرنے جاتا ہے تو وہ شخص صحیح مشورہ ہی دیتا ہے اور اپنی مقدور کے مطابق اس کی اعانت بھی کرتا ہے، گویا استخارہ کیا ہے؟ حق تعالیٰ سے مشورہ لینا ہے، اپنی درخواست استخارہ کی شکل میں پیش کردی، حق تعالیٰ سے بڑھ کر کون رحیم وکریم ہے؟ اس کا کرم بے نظیر ہے، علم کامل ہے اور قدرت بے عدیل ہے، اب جو صورت انسان کے حق میں مفید ہوگی، حق تعالیٰ اس کی توفیق دے گا، اس کی رہنمائی فرمائے گا، پھر نہ سوچنے کی ضرورت، نہ خواب میں نظر آنے کی حاجت، جو اس کے حق میں خیر ہوگا وہی ہوگا، چاہے اس کے علم میں اس کی بھلائی آئے یا نہ آئے، اطمینان وسکون فی الحال حاصل ہو یا نہ ہو، ہوگا وہی جو خیر ہوگا، یہ ہے استخارہ مسنونہ کا مطلوب! اسی لئے تمام امت کے لئے تاقیامت یہ دستور العمل چھوڑا گیا ہے''۔[دورحاضر کے فتنے اوران کا علاج]

استخارہ کی حکمت

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''حجة الله البالغة''

میں استخارہ کی دو حکمتیں بیان فرمائیں ہیں:

۱- فال نکالنے سے نجات اور اس کی حرمت

۱-پہلی حکمت یہ کہ زمانہ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کوئی اہم کام کرنا ہوتا مثلاً سفر یا نکاح یا کوئی بڑا سودا کرنا ہوتا تو وہ تیروں کے ذریعے فال نکالا کرتے تھے، یہ تیر کعبہ شریف کے مجاور کے پاس رہتے تھے، ان میں سے کسی تیر پر لکھا ہوتا "امرنی ربی" (میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے) اور کسی پر لکھا ہوتا "نہانی ربی" (میرے رب نے مجھے منع کیا ہے) اور کوئی تیر بے نشان ہوتا، اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں ہوتا تھا، مجاور تھیلا ہلا کر فال طلب کرنے والے سے کہتا کہ ہاتھ ڈال کر ایک تیر نکال لے، اگر "امرنی ربی" (کام کے حکم) والا تیر نکلتا تو وہ شخص کام کرتا اور "نہانی ربی" (کام سے منع) والا تیر نکلتا تو وہ کام سے رک جاتا اور بے نشان تیر ہاتھ میں آتا تو دوبارہ فال نکالی جاتی، سورۃ مائدہ آیت نمبر ۳ کے ذریعے اس کی حرمت نازل ہوئی، اور حرمت کی دو وجہیں ہیں:

۱-یہ ایک بے بنیاد عمل ہے اور محض اتفاق ہے، جب بھی تھیلے میں ہاتھ ڈالا جائے گا تو کوئی نہ کوئی تیر ضرور ہاتھ آئے گا۔

۲-اس طرح سے فال نکالنا یہ اللہ تعالی پر افترا اور جھوٹا الزام ہے، اللہ تعالی نے کہاں حکم دیا ہے اور کب منع کیا ہے؟ اور اللہ پر افترا، حرام ہے۔

نبی ﷺ نے لوگوں کو فال کی جگہ استخارہ کی تعلیم دی ہے، اس میں حکمت یہ ہے کہ جب بندہ رب علیم سے رہنمائی کی التجا کرتا ہے تو اپنے معاملے کو اپنے مولی کے حوالے کرکے اللہ کی مرضی معلوم کرنے کا شدید خواہش مند ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالی کے دروازے پر جا پڑتا ہے اور اس کا دل ملتجی ہوتا ہے تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالی اپنے بندے کی رہنمائی اور مدد نہ فرمائیں، اللہ تعالی کی طرف سے فیضان کا باب کشادہ ہوتا ہے، اور اس پر معاملہ کا راز کھولا جاتا ہے، چنانچہ استخارہ محض اتفاق نہیں ہے، بلکہ اس کی مضبوط بنیاد ہے۔

۲- فرشتوں سے مشابہت

۲-دوسری حکمت یہ کہ استخارہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان فرشتہ صفت بن جاتا ہے، استخارہ کرنے والا اپنی ذاتی رائے سے نکل جاتا ہے اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کردیتا ہے، اس کی بہیمیت (حیوانیت) ملکیت (فرشتہ صفتی) کی تابع داری کرنے لگتی ہے اور وہ اپنا رخ پوری طرح اللہ کی طرف جھکا دیتا ہے تو اس میں فرشتوں کی سی خو بو پیدا ہوجاتی ہے، ملائکہ

الہام ربانی کا انتظام کرتے ہیں اور جب ان کو الہام ہوتا ہے تو وہ داعیہ ربانی سے اس معاملے میں اپنی سی پوری کوشش خرچ کرتے ہیں، ان میں کوئی داعیہ نفسانی نہیں ہوتا، اسی طرح جو بندہ بکثرت استخارہ کرتا ہے وہ رفتہ رفتہ فرشتوں کے مانند ہوجاتا ہے، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ملائکہ کے مانند بننے کا یہ ایک تیر بہدف مجرب نسخہ ہے جو چاہے آزما کر دیکھے۔ [حجۃ اللہ البالغۃ]

استخارہ کا مسنون اور صحیح طریقہ

سنت کے مطابق استخارہ کا سیدھا سادہ اور آسان طریقہ یہ ہے کہ دن رات میں کسی بھی وقت [بشرطیکہ وہ نفل کی ادائیگی کا مکروہ وقت نہ ہو] دو رکعت نفل استخارہ کی نیت سے پڑھیں، نیت یہ کرے کہ میرے سامنے یہ معاملہ یا مسئلہ ہے، اس میں جو راستہ میرے حق میں بہتر ہو، اللہ تعالی اس کا فیصلہ فرمادیں۔

سلام پھیر کر نماز کے بعد استخارہ کی وہ مسنون دعا مانگیں جو حضور ﷺ نے تلقین فرمائی ہے، یہ بڑی عجیب دعا ہے، اللہ جل شانہ کے نبی ہی یہ دعا مانگ سکتے ہے اور کسی کے بس کی بات نہیں، کوئی گوشہ زندگی کا اس دعاء میں نبی ﷺ نے چھوڑا نہیں، اگر انسان ایڑی چوٹی کا زور لگالیتا تو بھی ایسی دعا کبھی نہ کرسکتا جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائی، اگر کسی کو دعا یاد نہ ہو تو کوئی بات نہیں کتاب سے دیکھ کر یہ دعا مانگ لے، اگر عربی میں دعا مانگنے میں دقت ہورہی ہو تو ساتھ ساتھ اردو میں بھی یہ دعا مانگے، بس! دعا کے جتنے الفاظ ہیں، وہی اس سے مطلوب ومقصود ہیں، وہ الفاظ یہ ہیں:

استخارہ کی مسنون دعا

اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ أَسۡتَخِیۡرُکَ بِعِلۡمِکَ ، وَ أَسۡتَقۡدِرُکَ بِقُدۡرَتِکَ، وَ أَسۡأَلُکَ مِنۡ فَضۡلِکَ الۡعَظِیۡمِ ، فَاِنَّکَ تَقۡدِرُ وَ لَا أَقۡدِرُ، وَ تَعۡلَمُ وَلَا أَعۡلَمُ ، وَ أَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ .

اَللّٰھُمَّ اِنۡ کُنۡتَ تَعۡلَمُ أَنَّ ھٰذَا الۡأَمۡرَ خَیۡرٌ لِّیۡ فِیۡ دِیۡنِیۡ وَ مَعَاشِیۡ وَ عَاقِبَةِ أَمۡرِیۡ وَ عَاجِلِہٖ وَ اٰجِلِہٖ ، فَاقۡدِرۡہُ لِیۡ ، وَ یَسِّرۡہُ لِیۡ ، ثُمَّ بَارِکۡ لِیۡ فِیۡہِ .

وَ اِنۡ کُنۡتَ تَعۡلَمُ أَنَّ ھٰذَا الۡأَمۡرَ شَرٌّ لِّیۡ فِیۡ دِیۡنِیۡ وَمَعَاشِیۡ وَ عَاقِبَةِ أَمۡرِیۡ وَ عَاجِلِہٖ وَ اٰجِلِہٖ ، فَاصۡرِفۡہُ عَنِّیۡ وَاصۡرِفۡنِیۡ عَنۡہُ ، وَاقۡدِرۡ لِیَ الۡخَیۡرَ حَیۡثُ کَانَ ثُمَّ اَرۡضِنِیۡ بِہٖ. [بخاری، ترمذی]

دعا کرتے وقت جب ”ھذا الامر“ پر پہنچے [جس کے نیچے لکیر بنی ہے] تو اگر عربی جانتا

ہے تو اس جگہ اپنی حاجت کا تذکرہ کرے یعنی ”ھذا الامر “ کی جگہ اپنے کام کا نام لے، مثلاً ”ھذا السفر “ یا ”ھذا النکاح “ یا ”ھذہ التجارۃ “ یا ”ھذا البیع “ کہے، اور اگر عربی نہیں جانتا تو ”ھذا الأمر “ ہی کہہ کر دل میں اپنے اس کام کے بارے میں سوچے اور دھیان دے جس کے لیے استخارہ کر رہا ہے۔

استخارہ کی دعا کا مطلب ومفہوم

اے اللہ! میں آپ کے علم کا واسطہ دے کر آپ سے خیر اور بھلائی طلب کرتا ہوں اور آپ کی قدرت کا واسطہ دے کر میں اچھائی پر قدرت طلب کرتا ہوں، آپ غیب کو جاننے والے ہیں۔

اے اللہ ! آپ علم رکھتے ہیں میں علم نہیں رکھتا، یعنی یہ معاملہ میرے حق میں بہتر ہے یا نہیں ،اس کا علم آپ کو ہے، مجھے نہیں، اور آپ قدرت رکھتے ہیں اور مجھ میں قوت نہیں۔

یا اللہ ! اگر آپ کے علم میں ہے کہ یہ معاملہ (اس موقع پر اس معاملہ کا تصور دل میں لائیں جس کے لیے استخارہ کر رہا ہے) میرے حق میں بہتر ہے، میرے دین کے لیے بھی بہتر ہے، میری معاش اور دنیا کے اعتبار سے بھی بہتر ہے اور انجام کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہے اور میرے فوری نفع کے اعتبار سے اور دیر پا فائدے کے اعتبار سے بھی تو اس کو میرے لیے مقدر فرما دیجیے اور اس کو میرے لیے آسان فرما دیجیے اور اس میں میرے لیے برکت پیدا فرما دیجیے۔

اور اگر آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ یہ معاملہ (اس موقع پر اس معاملہ کا تصور دل میں لائیں جس کے لیے استخارہ کر رہا ہے) میرے حق میں برا ہے، میرے دین کے حق میں برا ہے یا میری دنیا اور معاش کے حق میں برا ہے یا میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے، فوری نفع اور دیر پا نفع کے اعتبار سے بھی بہتر نہیں ہے تو اس کام کو مجھ سے پھیر دیجیے اور مجھے اس سے پھیر دیجیے اور میرے لیے خیر مقدر فرما دیجیے جہاں بھی ہو، یعنی اگر یہ معاملہ میرے لیے بہتر نہیں ہے تو اس کو چھوڑ دیجیے اور اس کے بدلے جو کام میرے لیے بہتر ہو اس کو مقدر فرما دیجیے، پھر مجھے اس پر راضی بھی کر دیجیے اور اس پر مطمئن بھی کر دیجیے۔ [اصلاحی خطبات]

استخارہ کتنی بار کیا جائے؟

حضرت انسؓ ایک روایت میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ انس! جب

تم کسی کام کا ارادہ کرو تو اس کے بارے میں اللہ تعالی سے سات مرتبہ استخارہ کرو، پھر اس کے بعد (اس کا نتیجہ) دیکھو، تمہارے دل میں جو کچھ ڈالا جائے، یعنی استخارے کے نتیجے میں بارگاہ حق کی جانب سے جو چیز القار کی جائے اسی کو اختیار کرو کہ تمہارے لیے وہی بہتر ہے۔[مظاہر حق]

بہتر یہ ہے کہ استخارہ تین سے سات دن تک پابندی کے ساتھ متواتر کیا جائے، اگر اس کے بعد بھی تذبذب اور شک باقی رہے تو استخارہ کا عمل مسلسل جاری رکھے، جب تک کسی ایک طرف رجحان نہ ہو جائے کوئی عملی اقدام نہ کرے، اس موقع پر اتنی بات سمجھنی ضروری ہے کہ استخارہ کرنے کے لیے کوئی مدت متعین نہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ایک ماہ تک استخارہ کیا تھا تو ایک ماہ بعد آپ کو شرح صدر ہو گیا تھا اگر شرح صدر نہ ہوتا تو آپ آگے بھی استخارہ جاری رکھتے۔[رحمۃ اللہ الواسعۃ]

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''دعائے استخارہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی سے دعائے خیر کرتا رہے، استخارہ کرنے کے بعد ندامت نہیں ہوتی اور یہ مشورہ کرنا نہیں ہے، کیونکہ مشورہ تو دوستوں سے ہوتا ہے، استخارہ سنت عمل ہے، اس کی دعا مشہور ہے، اس کے پڑھ لینے سے سات روز کے اندر اندر قلب میں ایک رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور یہ خواب میں کچھ نظر آنا، یا یہ قلبی رجحان حجت شرعیہ نہیں ہیں کہ ضرور ایسا کرنا ہی پڑے گا، اور یہ جو دوسروں سے استخارہ کرایا کرتے ہیں، یہ کچھ نہیں ہے، بعض لوگوں نے عملیات مقرر کر لیے ہیں دائیں طرف یا بائیں طرف گردن پھیرنا یہ سب غلط ہیں، ہاں دوسروں سے کرا لینا گناہ تو نہیں لیکن اس دعا کے الفاظ ہی ایسے ہیں کہ خود کرنا چاہیے''۔[مجالس مفتی اعظم]

استخارہ کا نتیجہ اور مقبول ہونے کی علامت
استخارہ سے کس طرح رہنمائی ملے گی؟

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استخارہ کا صرف اتنا اثر ہوتا ہے کہ جس کام میں تردد اور شک ہو کہ یوں کرنا بہتر ہے یا یوں؟ یا یہ کرنا بہتر ہے یا نہیں؟ تو استخارے کے مسنون عمل سے دو فائدے ہوتے ہیں:

۱- دل کا کسی ایک بات پر مطمئن ہو جانا۔

۲- اور اس مصلحت کے اسباب میسر ہو جانا۔

تاہم اس میں خواب آنا ضروری نہیں ۔[اصلاح انقلاب امت]

استخارہ میں صرف یکسوئی کا حاصل ہونا استخارہ کے مقبول ہونے کی دلیل ہے، اس کے بعد اس کے مقتضی پر عمل کرے، اگر کئی مرتبہ استخارہ کے بعد بھی یکسوئی اور کسی ایک جانب اطمینان نہ ہوتو استخارہ کے ساتھ ساتھ استشارہ بھی کرے یعنی اس کام میں کسی سے مشورہ بھی لے لیکن استخارہ میں ضروری نہیں کہ یکسوئی ہوا ہی کرے ۔[الکلام الحسن]

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ استخارہ کرنے کے بعد خود انسان کے دل کا رجحان ایک طرف ہوجاتا ہے، بس جس طرف رجحان ہوجائے وہ کام کرلے، اور بکثرت ایسا رجحان ہوجاتا ہے، لیکن بالفرض اگر کسی ایک طرف رجحان نہ بھی ہو بلکہ دل میں کشمکش موجود ہوتو بھی استخارہ کا مقصد حاصل ہوگیا، اس لیے کہ بندہ کے استخارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ وہی کرتے ہیں جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں پھر وہی ہوتا ہے جس میں بندے کے لیے خیر ہوتی ہے اور اس کو پہلے سے معلوم بھی نہیں ہوتا، بعض اوقات انسان ایک راستے کو بہت اچھا سمجھ رہا ہوتا ہے لیکن اچانک رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو اس بندے سے پھیر دیتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ استخارہ کے بعد اسباب ایسے پیدا فرمادیتے ہیں کہ پھر وہی ہوتا ہے جس میں بندے کے لیے خیر ہوتی ہے، اب خیر کس میں ہے؟ انسان کو پتہ نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادیتے ہیں۔

بس استخارہ کی حقیقت اتنی سی ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر دعا مانگ لی، پھر آگے جو ہوگا اسی میں خیر ہے، کام ہوگیا تو خیر! نہیں ہوا تو خیر! دل جس طرف متوجہ ہوجائے اور جس کے اسباب پیدا ہورہے ہوں یقین کرلیں کہ یہی میرے لیے بہتر ہے اور اگر دل کی توجہ ہٹ گئی یا اسباب پیدا نہیں ہوئے یا اسباب موجود تھے مگر استخارہ کے بعد ختم ہوگئے، کام نہیں ہوسکا تو اطمینان رکھے، اللہ پر یقین رکھے کہ اس میں میری بہتری ہوگی، اپنی طبیعت بہت چاہتی ہے مگر اللہ تعالیٰ میرے نفع ونقصان کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں، اس طرح سوچنے سے ان شاء اللہ اطمینان ہوجائے گا، اگر دل کا رجحان کسی جانب نہ ہوتو صرف اسباب کے پیش نظر جو فیصلہ بھی کرلے گا اس میں خیر ہوگی، خدانخواستہ اگر استخارہ کے بعد کوئی نقصان بھی ہوجائے تو یہ عقیدہ رکھے کہ استخارہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے چھوٹے نقصان کے ذریعے کسی بڑے نقصان سے بچالیا، استخارہ کی دعا میں دین کا ذکر پہلے ہے اور دنیا کا بعد میں، اس لیے کہ مسلمان کا اصل مقصد دین ہے، دنیا تو درحقیقت دین کے تابع ہے۔

استخارہ کے باوجود اگر نقصان ہو گیا تو؟!

عن مكحول الازدی رحمه الله تعالى قال : سمعت ابن عمر رضی الله تعالى عنه يقول: ان الرجل يستخير الله تبارك وتعالى فيختار له، فيسخط على ربه عز وجل، فلا يلبث ان ينظر فی العاقبة فاذا هو خير له. [كتاب الزهد]

مکحول ازدی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہما کا یہ ارشاد سنا ،فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان اللہ تعالی سے استخارہ کرتا ہے کہ جس کام میں میرے لیے خیر ہو وہ کام ہو جائے تو اللہ تعالی اس کے لیے وہ کام اختیار فرمادیتے ہیں جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے ،لیکن ظاہری اعتبار سے وہ کام اس بندہ کی سمجھ میں نہیں آتا تو بندہ اپنے پروردگار سے ناراض ہوتا ہے کہ میں نے اللہ تعالی سے تو یہ کہا تھا کہ میرے لیے اچھا کام تلاش کیجیے ،لیکن جو کام ملا وہ تو مجھے اچھا نظر نہیں آرہا ہے، اس میں میرے لیے تکلیف اور پریشانی ہے، لیکن کچھ عرصے بعد جب انجام سامنے آتا ہے تب اس کو پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں اللہ تعالی نے میرے لیے جو فیصلہ کیا تھا وہی میرے حق میں بہتر تھا، اس وقت اس کو پتہ نہیں تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ میرے ساتھ زیادتی اور ظلم ہوا ہے، اور اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالی کے فیصلے کا صحیح ہونا بعض اوقات دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات آخرت میں ظاہر ہوگا۔

اب جب وہ کام ہو گیا تو ظاہری اعتبار سے بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ جو کام ہوا وہ اچھا نظر نہیں آرہا ہے، دل کے مطابق نہیں ہے، تو اب بندہ اللہ تعالی سے شکوہ کرتا ہے کہ یا اللہ! میں نے آپ سے استخارہ کیا تھا مگر کام وہ ہو گیا جو میری مرضی اور طبیعت کے خلاف ہے اور بظاہر یہ کام اچھا معلوم نہیں ہو رہا ہے، اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرمارہے ہیں کہ ارے نادان! تو اپنی محدود عقل سے سوچ رہا ہے کہ یہ کام تیرے حق میں بہتر نہیں ہوا، لیکن جس کے علم میں ساری کائنات کا نظام ہے وہ جانتا ہے کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور کیا بہتر نہیں تھا، اس نے جو کیا وہی تیرے حق میں بہتر تھا، بعض اوقات دنیا میں تجھے پتہ چل جائے گا کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور بعض اوقات پوری زندگی میں کبھی پتہ نہیں چلے گا، جب آخرت میں پہنچے گا تب وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ واقعتہ یہی میرے لیے بہتر تھا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے ایک بچہ ہے جو ماں باپ کے سامنے مچل رہا ہے کہ فلاں چیز

کھاؤں گا اور ماں باپ جانتے ہیں کہ اس وقت یہ چیز کھانا بچے کے لیے نقصان دہ اور مہلک ہے، چنانچہ ماں باپ بچے کو وہ چیز نہیں دیتے، اب بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میرے ماں باپ نے مجھ پر ظلم کیا، میں جو چیز مانگ رہا تھا وہ مجھے نہیں دی اور اس کے بدلے میں مجھے کڑوی کڑوی دوا کھلا رہے ہیں، اب وہ بچہ اس دوا کو اپنے حق میں خیر نہیں سمجھ رہا ہے لیکن بڑا ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ اس بچے کو عقل اور فہم عطا فرمائیں گے اور اس کو سمجھ آئے گی تو اس وقت اس کو پتہ چلے گا کہ میں تو اپنے لیے موت مانگ رہا تھا اور میرے ماں باپ میرے لیے زندگی اور صحت کا راستہ تلاش کررہے تھے، اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ وہ راستہ اختیار فرماتے ہیں جو انجام کار بندہ کے لیے بہتر ہوتا ہے، اب بعض اوقات اس کا بہتر ہونا دنیا میں پتہ چل جاتا ہے اور بعض اوقات دنیا میں پتہ نہیں چلتا۔

یہ کمزور انسان کس طرح اپنی محدود عقل سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کا ادراک کرسکتا ہے، وہی جانتے ہیں کہ کس بندے کے حق میں کیا بہتر ہے؟ انسان صرف ظاہر میں چند چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو برا ماننے لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا کہ کس کے حق میں کیا اور کب بہتر ہے۔

اسی وجہ سے اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمارہے ہیں کہ جب تم کسی کام کا استخارہ کرچکو تو اس کے بعد اس پر مطمئن ہوجاؤ کہ اب اللہ تعالیٰ جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ خیر ہی کا فیصلہ فرمائیں گے، چاہے وہ فیصلہ ظاہر نظر میں تمہیں اچھا نظر نہ آرہا ہو، لیکن انجام کے اعتبار سے وہی بہتر ہوگا، اور پھر اس کا بہتر ہونا یا تو دنیا ہی میں معلوم ہوجائے گا، ورنہ آخرت میں جاکر تو یقیناً معلوم ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا تھا وہی میرے حق میں بہتر تھا۔[اصلاحی خطبات]

استخارہ کے بارے میں چند کوتاہیاں اور غلط فہمیاں

مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''اب دیکھئے یہ [استخارہ] کس قدر آسان کام ہے مگر اس میں بھی شیطان نے کئی پیوند لگادیے ہیں:

۱- پہلا پیوند یہ کہ دو رکعت پڑھ کر کسی سے بات کیے بغیر سوجاؤ، سونا ضروری ہے ورنہ استخارہ بے فائدہ رہے گا۔

۲- دوسرا پیوند یہ لگایا کہ لیٹو بھی دائیں کروٹ پر۔

۳- تیسرا یہ کہ قبلہ رو لیٹو۔

۴- چوتھا پیوند یہ لگایا کہ لیٹنے کے بعد اب خواب کا انتظار کرو، استخارہ کے دوران خواب نظر آئے گا۔

۵- پانچواں پیوند یہ لگایا کہ اگر خواب میں فلاں رنگ نظر آئے تو وہ کام بہتر ہوتا ہے، فلاں نظر آئے تو وہ بہتر نہیں۔

۶- چھٹا پیوند یہ لگایا کہ اس خواب میں کوئی بزرگ آئے گا بزرگ کا انتظار کیجیے کہ وہ خواب میں آکر سب کچھ بتادے گا، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ بزرگ کون ہوگا؟ اگر شیطان ہی بزرگ بن کر خواب میں آجائے تو اس کو کیسے پتہ چلے گا کہ یہ شیطان ہے یا کوئی بزرگ؟

یاد رکھیے کہ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی حدیث سے ثابت نہیں، بس یہ باتیں لکھنے والوں نے کتابوں میں بغیر تحقیق کے لکھ دی ہیں، اللہ تعالی ان لکھنے والے مصنّفین پر رحم فرمائیں“۔

[خطبات الرشید]

باوضو، قبلہ رخ اور دائیں کروٹ پر سونا نیند کے آداب میں سے تو ضرور ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ استخارہ رات کو سونے سے پہلے ان مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ لازمی سمجھ کر کیا جائے۔

۱- استخارہ صرف اہم کام کے لیے نہیں!

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ صرف اسی کام میں ہے جو کام بہت اہم یا بڑا ہے اور جہاں انسان کے سامنے دو راستے ہیں یا جس کام میں انسان کو تردد یا شک ہے صرف ایسے ہی کاموں میں استخارہ کرنا چاہیے، چنانچہ آج کل عوام الناس کو اپنی زندگی کے صرف چند مواقع پر ہی استخارہ کے مسنون عمل کی توفیق نصیب ہوتی ہے، مثلاً نکاح کے لیے یا کاروبار کے لیے استخارہ کرلیا اور بس! گویا ہم ان چند گنے چنے مواقع پر تو اللہ سے خیر اور بھلائی کے طلب گار ہیں اور باقی تمام زندگی کے روز وشب میں ہم اللہ سے خیر مانگنے سے بے نیاز اور مستغنی ہیں، یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ استخارہ صرف اہم اور بڑے کاموں ہی میں نہیں ہے بلکہ اپنے ہر کام میں چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اللہ تعالی سے خیر اور بھلائی طلب کرنی چاہیے، اسی طرح استخارے میں یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کام میں تردد اور تذبذب ہو تب ہی استخارہ کیا جائے، بلکہ تردد نہ بھی ہو اور اس کام میں ایک ہی

صورت اور ایک ہی راستہ ہو تب بھی استخارہ کرنا چاہیے، حدیث نبوی کے الفاظ ہیں:

کان رسول اللہ ﷺ یعلمنا الاستخارۃ فی الامور کلھا.[بخاری]

یعنی حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام کو ہر کام میں استخارے یعنی اللہ سے خیر طلب کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔

۲- استخارہ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ ہمیشہ رات کو سوتے وقت ہی کرنا چاہیے یا عشاء کی نماز کے بعد ہی کرنا چاہیے، ایسا کوئی ضروری نہیں، بلکہ جب بھی موقع ملے اس وقت استخارہ کرلے، نہ رات کی کوئی قید ہے اور نہ دن کی کوئی قید ہے، نہ سونے کی کوئی قید ہے اور نہ جاگنے کی کوئی قید ہے بشرطیکہ وہ نفل کی ادائیگی کا مکروہ وقت نہ ہو۔

۳- استخارہ کے بعد خواب آنا ضروری نہیں

استخارہ کے بارے میں لوگوں کے درمیان طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''استخارہ'' کرنے کا کوئی خاص طریقہ اور خاص عمل ہوتا ہے، اس کے بعد کوئی خواب نظر آتا ہے اور اس خواب کے اندر ہدایت دی جاتی ہے کہ فلاں کام کرو یا نہ کرو، خوب سمجھ لیں کہ حضور اقدس ﷺ سے استخارہ کا جو مسنون طریقہ ثابت ہے، اس میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ کرنے کے بعد آسمان سے کوئی فرشتہ آئے گا یا کوئی کشف والہام ہوگا یا خواب آئے گا اور خواب کے ذریعے ہمیں بتایا جائے گا کہ یہ کام کرو یا نہ کرو، یاد رکھیے! خواب آنا کوئی ضروری نہیں کہ خواب میں کوئی بات ضرور بتائی جائے یا خواب میں کوئی اشارہ ضرور دیا جائے، بعض مرتبہ خواب میں آجاتا ہے اور بعض مرتبہ نہیں آتا۔

۴- کسی دوسرے سے ''استخارہ نکلوانا''

استخارہ کے باب میں لوگ ایک غلطی کرتے ہیں اس کی اصلاح بھی ضروری ہے وہ یہ کہ بہت سے لوگ خود استخارہ کرنے کی بجائے دوسروں سے کرواتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے

''استخارہ نکال دیجیے'' گویا جیسے فال نکالی جاتی ہے ویسے ہی استخارہ بھی نکال دیجیے، دوسروں سے استخارے کروانے کا مطلب تو وہی عمل ہوا جو جاہلیت میں مشرکین کیا کرتے تھے اور جس کے انسداد اور خاتمے کے لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو استخارے کی نماز اور دعا سکھائی، اور یہ اسی وجہ سے ہوا کہ لوگوں نے استخارے کو یہ سمجھ لیا ہے کہ اس سے گویا کوئی خبر مل جاتی ہے یا یہ الہام ہوجاتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے؟ جس طرح جاہلیت میں تیروں پر لکھ کر یہ معلوم کیا جاتا تھا اسی طرح آج کل تسبیح کے دانوں پر اس قسم کے استخارے کیے جا رہے ہیں، یہ طریقہ بالکل غلط ہے اور انتہا تو یہ ہوگئی کہ اب عوام میں یہ رواج چل پڑا ہے کہ ٹی وی اور ریڈیو پر استخارے نکلوائے جا رہے ہیں، حالانکہ استخارہ اللہ تعالی سے اپنے معاملے میں خیر اور بھلائی کا طلب کرنا ہے نہ کہ خبر کا معلوم کرنا۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہدایت یہ ہے کہ جس کا کام ہو وہ خود استخارہ کرے، دوسروں سے کروانے کا کوئی ثبوت نہیں، جب حضور اقدس ﷺ دنیا میں موجود تھے اس وقت صحابہ سے زیادہ دین پر عمل کرنے والا کوئی نہیں تھا اور حضور سے بہتر استخارہ کرنے والا بھی کوئی نہ تھا لیکن آج تک کہیں یہ نہیں لکھا کہ کسی صحابی نے حضور سے جا کر یہ کہا ہو کہ آپ میرے لیے استخارہ کر دیجیے، سنت طریقہ یہی ہے کہ صاحب معاملہ خود کرے، اسی میں برکت ہے۔ لوگ یہ سوچ کر کہ ہم تو گناہ گار ہیں، ہمارے استخارے کا کیا اعتبار؟ اس لیے خود استخارہ کرنے کی بجائے فلاں بزرگ اور عالم سے یا کسی نیک آدمی سے کرواتے ہیں کہ اس میں برکت ہوگی، لوگوں کا یہ زعم اور یہ عقیدہ غلط ہے، جس کا کام ہو وہ خود استخارہ کرے خواہ وہ نیک ہو یا گناہ گار، دوسرے سے استخارہ کرانا اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، خود دعا کے الفاظ سے بھی یہی مترشح ہو رہا ہے، دعا کے الفاظ میں متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اس لیے صاحب معاملہ کو خود کرنا چاہیے، استخارہ دوسرے سے کروانا، ناجائز تو نہیں لیکن بہتر اور مسنون بھی نہیں ہے۔ سلامتی کا طریقہ وہی ہے جو نبی کریم ﷺ کا طریقہ ہے کہ صاحب معاملہ خود کرے۔

۵- ہم گناہ گار ہیں! استخارہ کیسے کریں؟

انسان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، بندہ تو اللہ ہی کا ہے اور جب بندہ اللہ سے مانگے گا تو جواب ضرور آئے گا، جس ذات کا یہ فرمان ہو کہ ''ادعونی استجب لکم'' مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔ تو یہ اس عظیم و کبیر ذات کے ساتھ بدگمانی ہے، وہ ذات تو ایسی ہے کہ شیطان جب

جنت سے نکالا جارہا ہے راندہ درگاہ کیا جارہا ہے تو اس وقت شیطان نے دعا کی، اللہ نے اس کی دعا کو قبول فرمایا، جو شیطان کی دعا قبول کررہا ہے کیا وہ ہم گناہ گاروں کی دعا قبول نہ کرے گا اور جب کوئی استخارہ رسول اللہ کی اتباع سنت کے طور پر کرے گا تو یہ ممکن نہیں کہ اللہ دعا نہ سنے بلکہ ضرور سنے گا اور خیر کو مقدر فرمائے گا، اللہ کی بارگاہ میں سب کی دعائیں سنی جاتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ گناہوں سے بچنا چاہیے تاکہ دعا جلد قبول ہو۔

لوگوں میں بکثرت یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ گناہ گار استخارہ نہیں کرسکتے، یہ دو وجہ سے باطل اور غلط ہے:

۱- پہلی وجہ یہ کہ گناہوں سے بچنا آپ کے اختیار میں ہے، مسلمان ہوکر کیوں گناہ گار ہیں؟ گناہ صادر ہوگیا تو صدق دل سے توبہ کرلیجیے، بس گناہوں سے پاک ہوگئے، گناہ گار نہ رہے، نیک لوگوں کے زمرے میں شامل ہوگئے، توبہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے پاک کردیا، اب اللہ کی اس رحمت کی قدر کریں اور آئندہ جان بوجھ کر گناہ نہ کریں۔

۲- دوسری وجہ یہ کہ استخارہ کے لیے شریعت نے تو کوئی ایسی شرط نہیں لگائی کہ استخارہ گناہ گار انسان نہ کرے، کوئی ولی اللہ کرے، جو شرط شریعت نے نہیں لگائی آپ اپنی طرف سے اس شرط کو کیوں بڑھاتے ہیں؟ شریعت کی طرف سے تو صرف یہ حکم ہے کہ جس کی حاجت ہو وہ استخارہ کرے خواہ وہ گناہ گار ہو یا نیک، جیسا بھی ہو خود کرے، عوام یہ کہتے ہیں کہ استخارہ کرنا بزرگوں کا کام ہے تو بزرگ حضرات بھی سمجھنے لگے کہ ہاں! یہ صحیح کہہ رہے ہیں، استخارہ کرنا ہمارا ہی کام ہے عوام کا کام نہیں، عوام کو غلطی پر تنبیہ کرنے کی بجائے خود غلطی میں شریک ہوگئے، ان کے پاس جو بھی چلا جائے یہ پہلے سے تیار بیٹھے ہیں کہ ہاں لائیں! آپ کا استخارہ ہم ''نکال دیں گے'' اور استخارہ کرنے کو ''استخارہ نکالنا'' کہتے ہیں، یاد رکھیں یہ ایک غلط روش ہے اور اس غلط روش کی اصلاح فرض ہے۔

۶- استخارہ کے ذریعہ گذشتہ یا آئندہ کا کوئی واقعہ معلوم کرنا

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: استخارہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی امر کے مصلحت یا خلاف مصلحت ہونے میں تردد ہو تو خاص دعا پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو، اس کے دل میں جو بات عزم اور پختگی کے ساتھ آئے اسی میں خیر سمجھے، استخارہ کا مقصد تردد اور شک ختم

کرنا ہے نہ کہ آئندہ کسی واقعے کو معلوم کر لینا۔

بعض لوگ استخارہ کی یہ غرض بتلاتے ہیں کہ اس سے گذشتہ زمانے میں پیش آنے والا کوئی واقعہ یا آئندہ ہونے والا واقعہ معلوم ہوجاتا ہے، سواستخارہ شریعت میں اس غرض سے منقول نہیں، بلکہ وہ تو محض کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا تردداور شک دور کرنے کے لیے ہے، نہ کہ واقعات معلوم کرنے کے لیے، بلکہ ایسے استخارہ کے ثمرہ اور نتیجے پر یقین کرنا بھی ناجائز ہے۔[اغلاط العوام]

۷- استخارہ کے ذریعے چور کا پتہ یا خواب میں کوئی بات معلوم کرنا

یادرکھنا چاہیے کہ جس طرح استخارہ سے گذشتہ زمانے میں پیش آنے والا کوئی واقعہ نہیں پتہ چل سکتا بالکل اسی طرح آئندہ پیش آنے والا واقعہ کہ فلاں بات یوں ہوگی معلوم نہیں کیا جاسکتا، اور اگر کوئی استخارہ کو اس غرض کے لیے سمجھے ہوئے ہے تو وہ اپنے غلط خیال کی اصلاح کرے کہ یہ بالکل باطل اعتقاد ہے، مثلاً کسی کے ہاں چوری ہوجائے تو اس غرض کے لیے کہ چور کا پتہ معلوم ہوجائے استخارہ کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ مفید ہے۔

اور بعض بزرگوں سے جو اس قسم کے بعض استخارے منقول ہیں جس سے کوئی واقعہ صراحتاً یا اشارۃً خواب میں نظر آجائے، سووہ استخارہ نہیں ہے بلکہ خواب نظر آنے کا عمل ہے، پھر اس کا یہ اثر بھی لازمی نہیں، خواب کبھی نظر آتا ہے اور کبھی نہیں اور اگر خواب نظر آ بھی گیا تو وہ محتاج تعبیر ہے، اگر چہ صراحت کے ساتھ نظر آئے پھر تعبیر جو ہوگی وہ بھی ظنی ہوگی یقینی نہیں، اس میں اتنے شبہات ہیں پس اس کو استخارہ کہنا یا مجاز ہے اگر ان بزرگوں سے یہ نام منقول ہے، ورنہ اغلاط عامہ میں سے ہے۔[اصلاح انقلاب امت]

۸- استخارہ کام کے ارادہ سے پہلے ہو

استخارہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ارادہ ابھی کرلو پھر برائے نام استخارہ بھی کرلو، استخارہ تو ارادہ سے پہلے کرنا چاہیے تاکہ ایک طرف قلب کو سکون پیدا ہوجائے، اس میں لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں، استخارہ اس شخص کے لیے مفید ہوتا ہے جو خالی الذہن ہو ورنہ جو خیالات ذہن میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں دل اسی جانب مائل ہوجاتا ہے اور وہ شخص اس غلط فہمی کا شکار رہتا ہے کہ یہ بات استخارہ سے معلوم ہوئی ہے۔

۹- استخارہ صرف جائز کاموں میں ہے

ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ استخارہ کا محل مباحات ہے، جو مباح یعنی جائز کام ہیں ان میں استخارہ کرنا چاہیے، جو چیزیں اللہ نے فرض کردی ہیں یا واجبات اور سنن مؤکدہ ہیں ان میں استخارے کی حاجت نہیں۔

اسی طرح جن کاموں کو اللہ اوراس کے رسول نے حرام اور ناجائز کردیا ہے ان میں بھی استخارہ نہیں ہے، مثلاً کوئی آدمی استخارہ کرے کہ نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں؟ روزہ رکھوں یا نہ رکھوں؟ تو یہاں استخارہ نہیں، یہ کام تو اللہ تعالی نے فرض کردیا ہے، یا کوئی شخص اس بارے میں استخارہ کرے کہ شراب پیوں یا نہ پیوں، رشوت لوں کہ نہ لوں، ویڈیو فلموں کا کاروبار کروں نہ کروں، سودی معاملہ کروں یا نہ کروں تو ان سب منہیات میں بھی استخارہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ سب تو حرام ہیں، استخارہ ان چیزوں میں کیا جائے جو جائز امور ہیں، رزق حلال کے حاصل کرنے اور کسب معاش کے لیے استخارے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تو فریضہ ہے استخارہ اس میں کیا جائے کہ رزق حلال کے حصول کے لیے ملازمت کروں یا تجارت کروں؟ تجارت کپڑے کی کی جائے یا اشیائے خورد ونوش کی؟ اب یہاں استخارہ کی ضرورت ہے، اسی طرح اگر حج کے لیے جانا ہو تو یہ استخارہ نہ کرے کہ میں جاؤں یا نہ جاؤں؟ بلکہ یوں استخارہ کرے کہ فلاں دن جاؤں یا نہ جاؤں؟۔

رشتوں کے لیے استخارہ

رشتہ کا معاملہ عام معاملات سے الگ ہے، یہ صرف اولاد کا کام نہیں بلکہ والدین کا کام بھی ہے، صحیح رشتہ کا انتخاب والدین ہی کرسکتے ہیں، یہ ان کی ذمہ داری ہے اور ان کو مستقبل کے حوالے سے سوچنا پڑتا ہے کہ کہاں رشتہ کریں؟ اس لیے بہتر یہ ہے کہ جن لڑکوں یا لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ ہے وہ خود بھی استخارہ کرلیں اور اگر ان کے والدین زندہ ہوں تو وہ بھی کرلیں۔

استخارہ ہر مشکل، پریشانی اور فتنے سے بچاؤ کا حل

محدث العصر حضرت بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

”دورِ حاضر میں امت کا شیرازہ جس بری طرح سے بکھر گیا ہے، مستقبل قریب میں اس کی

شیرازہ بندی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا، جب استشارے کا راستہ بند ہوگیا تو اب صرف استخارہ کا راستہ ہی باقی رہ گیا ہے، حدیث شریف میں تو فرمایا تھا:

مَاخَابَ مَنْ اِسْتَخَارَ وَمَا نَدِمَ مَنْ اِسْتَشَارَ.

ترجمہ: جو استخارہ کرے گا خائب وخاسر (ناکام اور نقصان اٹھانے والا) نہ ہوگا، اور جو مشورہ کرے گا وہ پشیمان شرمندہ نہ ہوگا۔

عوام کے لئے یہی دستور العمل ہے کہ اگر کوئی ان فتنوں میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا تو مسنون استخارہ کرکے عمل کرے اور امید ہے کہ استخارہ کے بعد اس کا قدم صحیح ہوگا، مسنون استخارہ کا مطلب یہی ہے کہ انسان جب کسی امر میں متحیر اور متردد ہوتا ہے اور کوئی واضح اور صاف پہلو نظر نہیں آتا، اس کا علم رہنمائی سے قاصر اور اس کی طاقت بہتر کام کرنے سے عاجز تو حق تعالی کی بارگاہ رحمت والطاف میں التجا کرتا ہے اور حق تعالی کی بارگاہ سے دعا، توکل تفویض اور تسلیم ورضا بالقضاء کے راستوں سے کرتا ہے کہ وہ اس کی دستگیری اور رہنمائی فرمائے، بہتر صورت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)''۔ [دور حاضر کے فتنے اور ان کا علاج]

استخارہ کے خود ساختہ طریقے اور ان کے مفاسد

اس زمانے کے مسلمانوں نے استخارہ کے کئی ایسے طریقے خود گھڑ لیے ہیں جن کا طریقہ مسنونہ سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں، رسول اللہ ﷺ نے جو استخارہ کا طریقہ بیان فرمایا درحقیقت وہ اللہ تعالی کے حکم سے ہے جو اللہ تعالی نے اپنے رسول کے ذریعے بندوں تک پہنچایا مگر بندوں نے یہ قدر کی کہ اسے پس پشت ڈال کر اپنی طرف سے کئی طریقے ایجاد کرلیے، اللہ تعالی نے جو استخارہ رسول اللہ ﷺ کو سکھایا آپ ﷺ نے وہی اپنی امت کو سکھایا اور ایسے اہتمام سے سکھایا جیسے قرآن کی سورت سکھاتے تھے۔

مگر آج کے مسلمانوں نے اللہ تعالی کے ارشاد فرمائے ہوئے طریقے کے مقابلے میں اپنی پسند کے مختلف طریقے گھڑ لیے ہیں، انہیں رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر اعتماد نہیں۔ تو وہ تمام طریقے مسنون نہیں ہے، کوئی تکیہ کے نیچے رکھنے کا ہے، کوئی سر کے گھوم جانے کا ہے، کوئی تسبیح پر پڑھنے کا ہے وغیرہ وغیرہ، اس میں سے کوئی سنت سے ثابت نہیں ہے بلکہ ان طریقوں میں تو ایک گونہ خطرے کا اندیشہ ہے، رسول اللہ کا سنت طریقہ چھوڑ کر دوسرے طریقے

اختیار کرنا پتہ نہیں اللہ کو پسند بھی ہو یا نہ ہو۔

وقت کی کمی اور فوری فیصلے کی صورت میں استخارے کا ایک اور مسنون طریقہ

سنت استخارے کا ایک تفصیلی طریقہ تو وہ ہوا جس کو ماقبل میں تفصیل سے بیان کر دیا گیا لیکن قربان جایے کہ رسول اللہ ﷺ نے وقت کی کمی اور فوری فیصلے کی صورت میں بھی ایک مختصر سا استخارہ تجویز فرمادیا تاکہ استخارے سے محرومی نہ ہوجائے، اس سے قبل استخارہ کا جو مسنون طریقہ عرض کیا گیا، یہ تو اس وقت ہے جب آدمی کو استخارہ کرنے کی مہلت اور موقع ہو، اس وقت تو وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھ کر وہ استخارہ کی مسنون دعا کرے، لیکن بسا اوقات انسان کو اتنی جلدی اور فوری فیصلہ کرنا پڑتا ہے، دو رکعت پڑھ کر دعا کرنے کا موقع ہی نہیں ہوتا، اس لیے کہ اچانک کوئی کام سامنے آگیا اور فوراً اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا ہے، اتنا وقت ہے نہیں کہ دو رکعت نفل پڑھ کر استخارہ کیا جائے تو ایسے موقع کے لیے خود نبی کریم ﷺ نے ایک دعا تلقین فرمائی، وہ یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ خِرْ لِیْ وَاخْتَرْ لِیْ. [کنز العمال]

اے اللہ! میرے لیے آپ پسند فرما دیجیے کہ مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے، بس یہ دعا پڑھ لے، اس کے علاوہ ایک اور دعا حضور ﷺ نے تلقین فرمائی ہے، وہ یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ وَسَدِّدْنِیْ. [صحیح مسلم]

اے اللہ! میری صحیح ہدایت فرمایے اور مجھے سیدھے راستے پر رکھیے۔

اسی طرح ایک اور مسنون دعا ہے:

اَللّٰھُمَ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ. [ترمذی]

اے اللہ! جو صحیح راستہ ہے وہ میرے دل پر القا فرما دیجیے، ان دعاؤں میں سے جو دعا یاد آجائے اس کو اسی وقت پڑھ لے، اور اگر عربی میں دعا یاد نہ آئے تو اردو ہی میں دعا کر لو کہ اے اللہ! مجھے یہ کشمکش پیش آئی ہے، آپ مجھے صحیح راستہ دکھا دیجیے، اگر زبان سے نہ کہہ سکو تو دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! یہ مشکل اور یہ پریشانی پیش آگئی ہے، آپ صحیح راستے پر ڈال دیجیے جو راستہ آپ کی رضا کے مطابق ہو اور جس میں میرے لیے خیر ہو۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا ساری عمر یہ معمول رہا کہ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا جس میں فوری فیصلہ کرنا ہوتا کہ یہ دو راستے ہیں ان میں سے ایک راستے کو اختیار کرنا ہے تو آپ اس وقت چند لمحوں کے لیے آنکھ بند کرلیتے، اب جو شخص آپ کی عادت سے واقف نہیں اس کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ آنکھ بند کرکے کیا کام ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ آنکھ بند کرکے ذرا سی دیر میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیتے اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرلیتے کہ یا اللہ! میرے سامنے یہ کشمکش کی بات پیش آگئی ہے، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا فیصلہ کروں، آپ میرے دل میں وہ بات ڈال دیجیے جو آپ کے نزدیک بہتر ہو، بس دل ہی دل میں یہ چھوٹا سا اور مختصر سا استخارہ ہوگیا۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ہر کام کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرماتے ہیں، اس لیے کہ تمہیں اس کا اندازہ نہیں کہ تم نے ایک لمحہ کے اندر کیا سے کیا کرلیا، یعنی اس ایک لمحے کے اندر تم نے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑ لیا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرلیا، اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ لی اور اپنے لیے صحیح راستہ طلب کرلیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تمہیں صحیح راستہ مل گیا اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا اجر بھی مل گیا اور دعا کرنے کا بھی اجر وثواب مل گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو بہت پسند فرماتے ہیں کہ بندہ ایسے مواقع پر مجھ سے رجوع کرتا ہے اور اس پر خاص اجر وثواب بھی عطا فرماتے ہیں، اس لیے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے، صبح سے لے کر شام تک نہ جانے کتنے واقعات ایسے پیش آتے ہیں جس میں آدمی کو کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں، اس وقت فوراً ایک لمحہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرلو، یا اللہ! میرے دل میں وہ بات ڈال دیجیے جو آپ کی رضا کے مطابق ہو۔ [اصلاحی خطبات]

الغرض استخارہ اللہ تعالیٰ سے خیر مانگنے اور بھلائی طلب کرنے کا مسنون ذریعہ ہے لہٰذا اس بات کی کوشش کی جائے کہ اس کی وہی اصل شکل اور روح برقرار رہے جو شریعت اسلام نے واضح فرمائی ہے، محض سنی سنائی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے حضرات علماء کرام سے رہنمائی حاصل کی جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح معنی میں سمجھ، اس پر عمل کرنے والا اور عملاً اس کو روئے زمین پر قائم کرنے والا بنائے، آمین۔

❁ ❁ ❁

وہ کتب جن سے استفادہ کیا گیا

۱-	حجۃ اللہ البالغۃ	حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ
۲-	مظاہر حق	علامہ محمد قطب الدین خان دہلوی رحمہ اللہ
۳-	اصلاح انقلاب امت	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ
۴-	اغلاط العوام	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ
۵-	اشرف العملیات	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ
۶-	الکلام الحسن	حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمہ اللہ
۷-	مجالس مفتی اعظم	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ
۸-	دور حاضر کے فتنے اور ان کا علاج	حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ
۹-	خطبات الرشید	حضرت مولانا مفتی رشید احمد رحمہ اللہ
۱۰-	تحفۃ المسلمین	حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی رحمہ اللہ
۱۱-	رحمۃ اللہ الواسعۃ	حضرت مولانا سعید احمد پالن پوری صاحب مدظلہ
۱۲-	اصلاحی خطبات	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اِس دنیا میں تشریف لائیں گے

از: محمد جنید رانچوی
متعلّم شعبہ تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند

مرزا غلام احمد قادیانی ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا، اور ۱۸۸۰ء سے ملہم من اللہ ہونے کا دعویٰ شروع کیا، اور ۱۸۸۲ء میں مجدّد اور مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ نیز واضح رہے کہ مرزا نے ۱۸۸۰ء تا ۱۸۸۴ء چار سال میں براہین احمدیہ کے نام پر ایک کتاب کی تصنیف مکمل کی، جس میں خود کو مجدّد اور مامور من اللہ ثابت کرنے کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تئیں جس عقیدے کا اظہار کیا ہے، دو عبارتیں پیش خدمت کیے جاتے ہیں:

”هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ.
یہ آیت جسمانی اور سیاستِ ملکی کے طور پر حضرت مسیح کے حق میں پیشگوئی ہے۔ اور جس غلبۂ کاملہ دینِ اسلام کا وعدہ دیا گیا ہے وہ غلبہ حضرت مسیح کے ذریعہ سے ظہور میں آئے گا۔ اور جب حضرتِ مسیح علیہ السلام دوبارہ اِس دنیا میں تشریف لائیں گے تو اُن کے ہاتھ سے دین اسلام جمیع آفاق اور اقطار میں پھیل جائے گا۔“

(براہین احمدیہ، خزائن، ج۱، ص:۵۹۳)

اور ۶۰۱ پر لکھتا ہے:

”عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَ عَلَیْکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جهنم لِلْکَافِرِیْنَ حَصِیْرًا“
یہ آیت اِس مقام میں حضرت مسیح کے جلالی طور پر ظاہر ہونے کا اشارہ ہے یعنی اگر طریقِ رفق اور نرمی اور لطف واحسان کو قبول نہیں کریں گے اور حق محض جو دلائلِ

واضحہ اور آیات بیّنہ سے کھل گیا ہے۔ اُس سے سرکش رہیں گے، تو وہ زمانہ بھی آنے والا ہے کہ جب خدائے تعالیٰ مجرمین کے لیے شدّت اور عنف اور قہر اور سختی کو استعمال میں لائے گا اور حضرتِ مسیح علیہ السلام نہایت جلالت کے ساتھ دنیا پر اتریں گے اور تمام راہوں اور سڑکوں کو خس وخاشاک سے صاف کردیں گے۔“

(براہین احمدیہ، روحانی خزائن، ج۱، ص:۶۰۲-۶۰۱)

نیز ۱۸۹۳ء میں جبکہ اس سے قبل مثیل مسیح اور مسیح ابن مریم ہونے کا دعویٰ کرچکا تھا، اپنی کتاب ”آئینۂ کمالات اسلام“ کے صفحہ ۴۰۹ پر لکھتا ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیں:

”الا یعلمون: ان المسیح ینزل من السماء بجمیع علومه. ولا یاخذ شیئاً من الارض مالهم لایشعرون“ (آئینۂ کمالات اسلام، خزائن، ج:۵، ص:۴۰۹)

مذکورہ بالا تینوں عبارتوں سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا قرآن سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف کوئی حدیث یا الہام یا کسی کا قول قابل حجت نہیں۔

۲- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا جسمانی طور پر ثابت ہے۔ لہٰذا ان کی جگہ کسی اور کا روحانی طور پر آنے کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔

۳- حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ہی کا آنا ثابت ہے۔ لہٰذا مرزا قادیانی ابن چراغ بی بی کا خود کو عیسیٰ کا مصداق ٹھہرانا غلط ہے۔

۴- حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام علوم سیکھ کر آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ لہٰذا مرزا کا ”فضل الٰہی“ کی شاگردی اختیار کرنے کے باوجود مسیحیت کا دعویٰ کرنا، اس کے جھوٹے ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

۵- حضرت ابن مریمؑ دوبارہ اِس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ لہٰذا حضرت مسیحؑ یہ وہی ابن مریمؑ ہوں گے جو ایک مرتبہ اس دنیا میں آچکے ہیں۔

۶- حضرت ابن مریمؑ اِس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ لہٰذا فی الحال کسی دوسرے دنیا یعنی آسمان پر موجود ہونا متحقق ہوگیا، جو قربِ قیامت دوبارہ اِس دنیا میں تشریف لائیں گے۔

۷- تشریف لائیں گے۔ لہٰذا مرزا جو چراغ بی بی عرف گھسیٹی کے پیٹ سے نکلا، مصداق نہیں، کیونکہ حضرت مسیحؑ پیدا نہیں ہوں گے بلکہ آسمان سے اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔

۸- غلبۂ کاملہ دین اسلام کا وعدہ حضرت مسیحؑ کے ذریعہ ظہور میں آئے گا۔لہٰذا مرزا قادیانی کا یہ دعویٰ کرنا کہ مذکورہ وعدہ میرے حق میں ہے فراڈ اور دھوکہ ہے۔

۹- اُن کے ذریعہ دین اسلام جمیع آفاق اور اقطار میں پھیل جائے گا۔لہٰذا مرزائیت جیسا کفر وزندقہ کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

۱۰- نہایت جلالیت کے ساتھ دنیا پر اتریں گے۔لہٰذا مرزا کا نحوست لیے ہوئے اپنی ماں کے پیٹ سے نکل کر مسیحیت کا دعویٰ کرنا،اس کے حمق کی دلیل ہے۔

یہ دس کی دس باتیں قرآن سے ثابت ہیں اور بقول مرزا قادیانی قرآن اورالہام سے ثابت ہیں،لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مرزائی مرزا قادیانی کو منوانا تو چاہتے ہیں،لیکن خود اس کی باتوں کو مان کر نہیں دیتے۔

دوسری قسط

پڑوسی کے حقوق

از: محمد عظیم فیض آبادی

اسلام حسین وخوشگوار ماحول اور الفت بھرے معاشرے کو نہ صرف یہ کہ پسند کرتا ہے بلکہ جابجا اس کی تعلیم وتاکید کرتا ہے ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے معاشرے کا پہلا فرد اس کا پڑوسی ہے جب ہر پڑوسی دوسرے پڑوسی کا ہر طرح خیال رکھے گا اس کے رنج وغم کے موقع پر اس کا مداویٰ اور مشقت، تکلیف و پریشانی کے وقت نصرت وحمایت، اور امداد کے لیے کھڑا رہے گا تو خود بخود اطمینان وسکون کی فضاء قائم ہوگی اور دین کا مقصد اجتماعیت کی صورت میں نمودار ہوگا اور امت کا ہر فرد اسلام کے سایہ تلے سکون کی زندگی گزار سکے گا بایں وجہ اسلام نے پڑوسی کے حقوق اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی حددرجہ تاکید کی ہے۔

آپ اسلام کی فراخدلی کہیے کہ اگر کافر پڑوسی ہو اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کی تعلیم دی ہے مسند بزار کے اندر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پڑوسی تین طرح کے ہیں ایک وہ پڑوسی جس کا صرف ایک حق ہے اور دوسرا وہ پڑوسی جس کے دو حق ہوں اور تیسرا وہ پڑوسی جس کے تین حق ہیں۔

ایک حق والا وہ غیر مسلم پڑوسی ہے جس سے کوئی قرابت ورشتہ داری بھی نہ ہو اس کے لیے صرف پڑوسی ہونے کا حق اور دو حق والا وہ پڑوسی ہے جو پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم دینی بھائی بھی ہو اس کا ایک مسلمان ہونے کا دوسرا حق پڑوسی ہونے کی وجہ سے اور تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی بھی ہو مسلمان بھی اور رشتہ دار بھی ہو تو اس کا ایک حق مسلمان ہونے کا دوسرا پڑوسی ہونے کا اور تیسرا حق قرابت ورشتہ داری کا ہوگا۔

جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ ایک دن ان کے گھر بکری ذبح ہوئی انھوں نے گھر والوں سے کہا اهديتم لجارنا اليهودی

اهديتم لجارنا اليهودى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول مازال جبرئيل يوصينى بالجار حتى ظننت انه سيورّثه. تم لوگوں نے ہمارے یہودی پڑوسی کے لیے بھی ہدیہ بھیجا؟ تم لوگوں نے ہمارے یہودی پڑوسی کے لیے بھی ہدیہ بھیجا؟ میں نے رسول اللہ ﷺ کو پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر تاکید کرتے ہوئے سنا کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دے دیں گے۔

پڑوسیوں کے حقوق ان کے اکرام واحترام، ان کی رعایت اوران کے ساتھ حسن سلوک کی جو تاکید قرآن وحدیث میں مذکور ہے ان میں غیر مسلم بھی داخل ہے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا یہودی نے اپنا مکان فروخت کرنا چاہا ایک آدمی نے پوچھا کتنے میں فروخت کروگے کہنے لگا کہ میں دو ہزار دینار میں فروخت کروں گا اس خریدار نے کہا کہ اس علاقے میں اس قسم کے مکان کی قیمت زیادہ سے زیادہ ایک ہزار دینار ہوتی ہے، یہودی کہنے لگا کہ ہاں ٹھیک ہے ایک ہزار دینار تو میرے مکان کی قیمت ہے اور ایک ہزار دینار عبداللہ بن مبارک کے پڑوس کی قیمت ہے ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کے پڑوس میں جو مکان ہوتے تھے ان مکان کی قیمتیں ان کے اخلاق وکرار کی خوبیوں کی وجہ سے بڑھ جایا کرتی تھیں اور آج یہ وقت آچکا ہے کہ یورپ کے بعض علاقوں میں مسلمان مکان لینے جاتے ہیں تو انھیں کوئی مکان کرایہ پر بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ابوحمزہ ''سکری'' حدیث کے معروف راوی ہیں جو''سکری'' کے لقب سے مشہور ہوئے ''سکر'' عربی زبان میں چینی کو کہتے ہیں ان کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھیں سکری اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ ان کی باتیں بڑی شیریں اوران کا لہجہ اوران کا انداز گفتگو بڑا ہی دلکش دلنشیں تھا جب وہ بات کرتے تو سننے والا ان کی باتوں میں محو ہوجاتا وہ شہر بغداد کے ایک محلے میں رہتے تھے کچھ عرصہ بعد انھوں نے اپنا مکان فروخت کرکے کسی دوسرے محلے میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا اور مکان خریدنے والے سے معاملہ بھی تقریباً طے ہوگیا تھا جب ان کے پڑوسیوں کو معلوم ہوا کہ وہ اس محلے سے منتقل ہوکر کہیں اور قیام کا ارادہ کرچکے ہیں تو محلے والے ایک وفد لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اوران سے منت وسماجت کی کہ وہ یہ محلّہ نہ چھوڑیں حضرت ابوحمزہ سکری نے اپنا عذر بیان کیا تو محلّہ والوں نے متفقہ طور پر انھیں یہ پیش کش کی کہ ان کے مکان کی جو قیمت لگی ہے ہم وہ قیمت آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ پیش کرتے ہیں لیکن آپ ہمیں اپنے پڑوس

سے محروم نہ کیجیے جب انھوں نے محلّہ والوں کے اس قدر خلوص کا مظاہر کیا تو اس محلے کے چھوڑنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

یہ ہے پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا نتیجہ وثمرہ کہ ایسے پڑوسی کی وجہ سے مکان کی قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے یا پھر مکان کی قیمت کے بقدر ہدیہ پیش کرکے ایسے پڑوسی کو کوچ کرنے سے روکا جاتا ہے اور ایسے پڑوسی کے چلے جانے سے اپنے آپ کو محروم تصور کیا جاتا ہے۔

پڑوسیوں کے حقوق کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات جس طرح ترک تعلق، زندگی کے معاملات میں ان کے ساتھ حسن رعایت اور حسن سلوک سے ہے اسی طرح تعلیم وتربیت کے متعلق بھی آپ نے تاکید وترغیب دی ہے۔ اگر کسی کے پڑوس میں ایسے غریب ونادار لوگ ہوں جو دینی تعلیم وتربیت اور اپنی عملی واخلاقی حالت کے لحاظ سے پسماندگی کا شکار ہوں تو دوسرے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت اور ان کے اصلاح کی فکر وکوشش کریں۔

حضرت علقمہ بن عبدالرحمان بن ابزیٰ نے اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا ابزیٰ خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے اور ان لوگوں کا کیا حال ہے (جنھیں اللہ نے علم وتفقہ کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور ان کے پڑوس میں ایسے پسماندہ لوگ مقیم ہیں جن کے پاس دین کا علم اور اس کی سمجھ بوجھ نہیں) وہ اپنے ان پڑوسیوں کو دین سکھانے اور دینی تعلیم دینے کا فریضہ انجام کیوں نہیں دیتے نہ ان کو وعظ ونصیحت کرتے ہیں نہ ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں اور ان (بے علم وپسماندہ) لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھنے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کی فکر نہیں کرتے اور نہ ان سے وعظ ونصیحت حاصل کرتے ہیں خدا کی قسم (دین کا علم اور اس کی سمجھ رکھنے والے) لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے (ناواقف وپسماندہ) پڑوسیوں کو دین سکھانے اور دین کی سمجھ بوجھ ان میں پیدا کرنے کی کوشش کریں اور وعظ ونصیحت (کے ذریعہ ان کی اصلاح) کریں اور انھیں نیک کاموں کی تاکید اور برے کاموں سے منع کریں۔ اور اسی طرح ان کے پسماندہ و ناآشنا پڑوسیوں کو چاہیے کہ وہ خود طالب بن کر اپنے (اہل علم) پڑوسیوں سے دین کا علم وفہم حاصل کریں اور ان سے نصیحت لیں یا پھر (یعنی اگر ان دونوں طبقے نے اپنا اپنا فرض ادا کیا) تو میں ان کو دنیا ہی میں سخت سزا دلواؤں گا۔

کنزل الاعمال میں حضور ﷺ کا یہی خطاب اس اضافہ کے ساتھ مذکور ہے کہ حضور ﷺ کا روئے سخن اس خطاب میں حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ عنہم کی قوم اشعریین کی طرف تھا اس قوم کے لوگ عموماً علم وتفقہ کی دولت سے مالامال تھے لیکن ان ہی کے علاقے اور پڑوس میں ایسے لوگ بھی آباد تھے جو تعلیم وتربیت کے لحاظ سے پسماندگی کے شکار تھے نہ ان میں تعلیم وتربیت تھی نہ ہی اس کے حصول کا جذبہ وفکر تھی اس لیے حضور ﷺ نے اپنے اس خطاب کے ذریعہ ان کو اس طرف متنبہ کیا اور بعد میں اس قوم کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر یہ وعدہ کیا کہ ہم انشاء اللہ ایک سال کے اندر اس قوم کے لوگوں کو دین کی تعلیم دیں گے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر علاقہ کے علماء وحفاظ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ وہ اپنے پاس پڑوس اور قرب وجوار میں بسنے والے ناواقف لوگوں کو دین کی تعلیم دیں اور دعوت وتبلیغ، وعظ ونصیحت کے ذریعہ ان کی اصلاح کی کوشش وفکر کرتے رہیں۔

اور اسی طرح ان ناواقف وناخواندہ لوگوں کو بھی اس بات کا ذمہ دار قرار دیا ہے کہ وہ اپنے قریب کے اہل علم ودین حضرات سے تعلیم وتربیت اور اصطلاح کا رابطہ رکھیں۔

افسوس ہے کہ عہد نبوی سے جتنا بُعد ہوتا گیا امت آپ کی تعلیمات وہدایات سے اسی قدر دور ہوتی چلی گئی رسول اللہ ﷺ نے پڑوسیوں، ہمسایوں کے بارے میں جو وصیت وتاکید امت کو فرمائی تھی اگر قرون اولیٰ کے بعد بھی امت کا اس پر عمل رہا ہوتا تو یقیناً امت کے کسی طبقہ میں بھی بے راہ روی دین سے بے خبری اور اللہ ورسول سے بے تعلقی، علمی پسماندگی اور فتنہ وفساد کا یہ عالم نہ ہوتا امت کی غالب اکثریت جس میں سرابور ہے۔

ایک زمانے سے دنیا تعلیمی ترقی کے لیے کوشاں ہے لیکن بین الاقوامی سطح پر اقوام عالم تعلیمی ترقی کے حصول اور علمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے خطیر رقمیں صرف کرنے اور گلی گلی گاؤں گاؤں اسکول، کالج اور بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے قیام اور تعلیم کے تعلق سے مختلف قسم کے سیمینار، کانفرنسوں اور میٹنگوں کے انعقاد کے باوجود آج بھی اپنے مقصد میں کلی طور پر کامیابی سے ہم کنار ہوتے نظر نہیں آتی۔ آج کے سوا چودہ سو سال پہلے معلم انسانیت محمد عربی ﷺ نے تعلیمی ترقی اور علمی پسماندگی کو ختم کرنے کے لیے قوم اشعریین کو جس اصول وطریقے کی تعلیم دی تھی آج کے یہی بہی خواہان قوم اگر اس زریں اصول کو پوری دنیا میں جاری ونافذ کردیں اور قوم کا ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے پڑوس میں بسنے والے ناخواندہ شخص کی تعلیم کا ذمہ دار بن جائے تو بہت جلد ان شاء اللہ قوم کا

ہرنا آشنا شخص شناشا بن جائے گا علمی پسماندگی دور ہوگی اوراس طرح پوری دنیا جہالت سے چھٹکارا حاصل کر کے علم کا گہوارہ بن جائے گی۔ دنیا کی بیشتر برائیاں صرف عدم تعلیم یا ناقص تعلیم کی وجہ سے ہیں اگر دنیا اس زریں اصول کوحرز جاں سمجھ لےتو پھر دنیا میں خیر کا غلبہ ہو۔

کم ازکم محمد عربی ﷺ کے پیروکاروں کو اسے قبول کرنے اورعمل کرنے کوسعادت ونیک بختی اوراجروثواب کا باعث سمجھ کراس کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔

بلاشبہ اس وقت اس امت کے اندر سب سے بڑی خدمات اورسب سے بڑا اصلاحی و تجدیدی کارنامہ یہی ہے کہ امت میں تعلیم وتعلم کے اس عمومی غیررسمی نظام کو پھر سے چلایا جائے اس حدیث پاک کے اندر جس کی ہدایت دی گئی ہے بڑے ہی خوش نصیب ہوں خدا کے وہ بندے جن کواس کی توفیق ملے۔

عورت دین کا کام کس طرح کرے

از: مولانا مفتی محمد اسماعیل طورو

جو عورت قاریہ ہو وہ عورتوں کا قرآن کی تعلیم درست کرے۔ جو حافظہ ہو وہ مستورات کو حافظہ بنائے۔ اور جو عالمہ ہو وہ مستورات کو شریعت کی حدود کے اندر رکھ کر عالمہ بنائے۔ اور عالم کس کو کہتے ہیں اس کے لیے ہمارا ''عمل بالقرآن'' آرہا ہے وہ دیکھ لیں، لیکن اگر ایک لڑکی نے B.A یا M.A کی تعلیم حاصل کی وہ عالمہ نہیں لہٰذا وہ عالمہ نہیں بنا سکتی اور قرآن کا درس بھی نہیں دے سکتی۔ علم نو ماہ کا کام نہیں ہے نہ دو سال بلکہ اس کے لیے ضروری علوم پڑھنے کی ضرورت ہے غور کریں انگلش جاننے والا ڈاکٹری کتب پڑھ کر ڈاکٹر نہیں بن سکتا ورنہ امریکہ اور لندن والے سارے ڈاکٹر ہوتے اور صرف عربی زبان جاننے سے بھی آدمی قرآن وحدیث کا عالم نہیں بنتا۔ جیسا کہ بعض جگہوں میں بورڈ لگے ہوتے ہیں ''آیئے عربی سیکھئے اور قرآن سمجھئے'' ورنہ عربی ممالک والے سارے عالم ہوتے لیکن وہاں باقاعدہ علم کے لیے دس بارہ سالہ کورس ہوتا ہے، میڈیکل پروفیسر ڈاکٹروں کو پڑھا سکتا ہے لیکن کمپاؤنڈر جاہلوں کو ڈاکٹری اصول وضوابط اور طریقہ علاج نہیں پڑھ سکتا۔ ہرگز نہیں اسی طرح نو دس ماہ سے آدمی عالم نہیں بن سکتا۔ بلکہ قرآن ٹھیک کر سکتا ہے اور کچھ نہ کچھ ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔ لہٰذا دنیاوی تعلیم یافتہ یا کچھ نہ کچھ قرآن کو سمجھنے والی درس نہ دے بلکہ وہ دین کا کام اس طرح کرے کہ ہر جگہ بچیوں کے دینی مدارس موجود ہیں وہاں سے کسی عالمہ کا اپنے محلے میں پردے کے ساتھ لے آنے اور لے جانے کا انتظام کرے اور وہ مستورات کو ماہانہ درس دے تاکہ عورتوں میں دین کی سمجھ آجائے اور اگر کوئی عالمہ بننا چاہے وہ مدرسہ میں داخل ہوجائے اور اگر ایسی کوئی عالمہ یا عالم دین میسر نہ ہو، تو پھر دنیاوی تعلیم یافتہ بھی قرآن کا درس دے سکتی ہے لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں:

۱- کسی جید عالم دین کی تفسیر مستورات کو پڑھ کر سنائے۔ سادہ قرآن سے درس نہ دے۔

۲- درس کے بعد اپنی تشریح نہ کرے۔

۳- مسئلے علماء سے پوچھے جائیں ددرس والی سے نہ پوچھے جائیں۔

۴- جو مستورات درس کے لیے آئیں وہ باپردہ آئیں اگر گھر فاصلہ پر ہو تو محرم کے ساتھ آئیں۔

۵- درس کا ٹائم دن کا ہو۔

۶- یہ درس کبھی کبھی کیا جائے کم از کم مدت ماہ میں ایک بار جلدی جلدی درس کرانے سے بار بار عورت کے نکلنے کی وجہ سے نقصانات کا خطرہ ہے۔

۷- ٹیپ ٹاپ سے اور مہنگے ہوٹلوں میں درس کا انتظام نہ کیا جائے... جہاں اکثر فاسق فاجر لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔

۸- درس صرف ایک قابل اعتماد گھر میں دیا جائے یہ نہیں کہ آج عورتیں ادھر جارہی ہیں اور کل اُدھر۔

۹- خاوند یا سرپرست کی اجازت ہو ورنہ اس کی اجازت کے بغیر دین کی مجلس میں جانا بھی غلط ہے ہاں اگر کسی ایسے شرعی مسئلہ کی ضرورت پڑ گئی جس پر عمل کرنا فرض ہو تو اس کے لیے مرد سے معلوم کرایا جائے اگر وہ نہ پوچھ آئے تو پھر خود پردے میں عالم سے پوچھ کر آئے۔
ساری مستورات جب اس کے مطابق چلیں گی تو انشاء اللہ ہم کو کوئی فتنہ گمراہ نہیں کرسکتا۔

اسلام میں دیگراقوام اور اہل مذاہب کے ساتھ حسن سلوک

از: جناب مولانا شوکت علی قاسمی بستوی
استاذ دارالعلوم دیوبند و ناظم عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام میں دیگراقوام اوراہل مذاہب کے حقوق:

یہ پروپیگنڈہ بڑے زوروشور سے کیا جارہا ہے کہ اسلام اوراس کے ماننے والے دوسرے مذہب والوں کو برداشت کرنے کے روادار نہیں، یہ ایک گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے، اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، یہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی عالمی سازش کا ایک حصہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام دینِ رحمت ہے، اس کا دامنِ محبت ورحمت ساری انسانیت کو محیط ہے۔ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ دیگراقوام اوراہل مذاہب کے ساتھ مساوات، ہمدردی، غم خواری ورواداری کا معاملہ کریں، اور اسلامی نظامِ حکومت میں ان کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی، بھید بھاؤ، امتیاز کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ ان کی جان ومال، عزت وآبرو، اموال وجائداد اور انسانی حقوق کی حفاظت کی جائے۔ ارشاد قرآنی ہے:

لَایَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْن (الممتحنہ:۸)

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جولڑے نہیں دین کے سلسلہ میں اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ کرو بھلائی اور انصاف کا سلوک، بے شک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: مکہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آپ مسلمان نہ ہوئے اور مسلمان ہونے والوں سے ضد اور پرخاش بھی نہیں رکھی نہ دین کے معاملہ میں ان سے لڑے، نہ ان کو ستانے اور نکالنے میں ظالموں کے مددگار بنے، اس قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ بھلائی اور خوش خلقی سے پیش آنے کو اسلام نہیں روکتا، جب وہ تمہارے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور دنیا کو دکھلا دو کہ اسلامی اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہیں کہ اگر غیر مسلموں کی ایک قوم مسلمانوں سے برسرپیکار ہے تو تمام غیر مسلموں کو بلاتمیز ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کردیں ایسا کرنا حکمت وانصاف کے خلاف ہوگا۔ (حاشیہ: ترجمہ شیخ الہند: ص:۷۲۹)

دیگر مذاہب والوں کے ساتھ تعاون اور عدم تعاون کا اسلامی اصول یہی ہے کہ ان کے ساتھ مشترک سماجی وملکی مسائل ومعاملات میں، جن میں شرعی نقطۂ نظر سے اشتراک وتعاون کرنے میں کوئی ممانعت نہ ہو ان میں ساتھ دینا چاہیے۔

دیگر مذاہب یا اقوام کے کچھ لوگ اگر مسلمانوں سے سخت عداوت اور دشمنی بھی رکھتے ہوں تب بھی اسلام نے ان کے ساتھ رواداری کی تعلیم دی ہے: ارشاد ربانی ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

(سورۂ فصلت: ۳۴)

بدی کا بدلہ نیکی سے دو پھر جس شخص کے ساتھ تمہاری عداوت ہے وہ تمہارا گرم جوش حامی بن جائے گا۔

کفار مکہ کے ساتھ حسن سلوک:

وہ کونسا ظلم تھا جو کفار ومشرکین نے مکہ مکرمہ میں سرکار دوعالم ﷺ اور صحابۂ کرام کے ساتھ روا نہ رکھا۔ آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر اور کاہن کہا گیا، آپ ﷺ کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئیں، آپ ﷺ پر پتھروں اور سنگریزوں کی بارش کی گئی، آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ ﷺ کا گلا گھونٹا گیا، نماز کی حالت میں آپ ﷺ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی، آپ ﷺ کے قتل کے منصوبے تیار کیے گئے۔ تین سال تک شعب ابی طالب میں آپ ﷺ کو محصور رکھا گیا۔ جس میں ببول کے پتے کھا کر گزارہ کرنے کی نوبت آئی، طائف میں آپ کو سخت اذیت پہنچائی گئی، لوگوں نے آپ ﷺ کو

گالیاں دیں اور اتنا زدوکوب کیا کہ آپ ﷺ کے نعلین مبارک خون سے لبریز ہوگئے۔ آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی سکون واطمینان سے رہنے نہیں دیا گیا۔ اور طرح طرح کی یورشیں جاری رکھی گئیں، یہودیوں کے ساتھ مل کر رحمتِ عالم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند مہم چھیڑ دی گئی۔ فتح مکہ کے موقع پر کفار مکہ کو موت اپنے سامنے نظر آرہی تھی ان کو خطرہ تھا کہ آج ان کی ایذا رسانیوں کا انتقام لیا جائے گا، سرکار دوعالم ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: اے قریشیو! تم کو کیا توقع ہے، اس وقت میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟ انھوں نے جواب دیا: ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا:

''میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی الزام نہیں؛ جاؤ تم سب آزاد ہو'' (زادالمعارج:۱/۴۲۴)

کیا انسانی تاریخ اس رحم وکرم کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟

یہودیوں کے ساتھ حسن سلوک:

یہودیوں کے مختلف قبائل مدینہ میں آباد تھے، نبی اکرم ﷺ کے مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد، ابتداءً یہود غیر جانب دار اور خاموش رہے لیکن اس کے بعد وہ اسلام اور نبی رحمت ﷺ اور مسلمانوں کے تئیں اپنی عداوت اور معاندانہ رویہ زیادہ دنوں تک نہ چھپا سکے۔ انہوں نے سرکارِ دوعالم ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی خفیہ سازشیں کیں، بغاوت کے منصوبے بنائے، آپ ﷺ کے کھانے میں زہر ملایا آپ ﷺ کو شہید کرنے کی تدبیریں سوچیں، اسلام اور مسلمانوں کو زَک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس کی ایک وجہ یہودیوں میں حسد، تنگ دلی، اور جمود وتعصب کا پایا جانا تھا۔ دوسرے ان کے عقائد باطلہ، اخلاق رذیلہ اور گندی سرشت تھی۔ لیکن قربان جایئے رحمتِ عالم ﷺ پر کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نہایت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سرکارِ دوعالم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ ایک اہم معاہدہ کیا تاکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم ہوں، اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں اور مشکلات میں ایک دوسرے کی مدد کریں، معاہدہ کی چند دفعات یہ تھیں۔

۱- تمام یہودیوں کوشہریت کے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اسلام سے پہلے انھیں حاصل تھے۔
۲- مسلمان تمام لوگوں سے دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
۳- اگر کوئی مسلمان کسی یثرب والے کے ہاتھ مارا جائے تو بہ شرط منظوری ورثاء قاتل سے خوں بہا لیا جائے گا۔
۴- باشندگان مدینہ میں سے جو شخص کسی سنگین جرم کا مرتکب ہو اس کے اہل وعیال سے اس کی سزا کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔
۵- موقع پیش آنے پر یہودی مسلمانوں کی مدد کریں گے، اور مسلمان یہودیوں کی۔
۶- حلیفوں میں سے کوئی فریق اپنے حلیف کے ساتھ دروغ گوئی نہیں کرے گا۔
۷- مظلوموں اور ستم رسیدہ شخص کی خواہ کسی قوم سے ہو مدد کی جائے گی۔
۸- یہود پر جو بیرونی دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمانوں پر ان کی امداد لازمی ہوگی۔
۹- یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔
۱۰- مسلمانوں میں سے جو شخص ظلم یا زیادتی کرے گا تو مسلمان اسے سزا دیں گے۔
۱۱- بنی عوف کے یہودی مسلمانوں میں ہی شمار ہوں گے۔
۱۲- یہودیوں اور مسلمانوں میں جس وقت کوئی قضیہ پیش آئیگا تو اس کا فیصلہ رسول اللہ کریں گے۔
۱۳- یہ عہد نامہ کبھی کسی ظالم یا خاطی کی جانب داری نہیں کریگا۔ (سیرۃ ابن ہشام: ص: ۵۰۱-تا-۵۰۴)

آپ نے ملاحظہ فرمایا اس معاہدے میں کس فیاضی اور انصاف کے ساتھ یہودیوں کو مساویانہ حقوق دیے گئے ہیں۔

سرکار دوعالم ﷺ اس معاہدے کے مطابق یہودیوں کے ساتھ برتاؤ کرتے رہے لیکن یہودیوں نے اس معاہدے کی پاس داری نہیں کی، مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ کی مدد کی اور اسلام اور مسلمانوں کے ہمیشہ درپے آزار رہے۔

عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک:

عیسائیوں کے ساتھ بھی سرور عالم ﷺ نے مثالی رواداری برتی۔ مکہ مکرمہ اور یمن کے درمیان واقع ''نجران'' کا ایک موقر وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا انھوں نے سرکار دوعالم ﷺ کے ساتھ مذہبی معاملات میں گفتگو کی عیسائیوں کے ساتھ

اس موقع پر ایک تاریخی معاہدہ ہوا، جس میں عیسائیوں کو مختلف حقوق دینے پر اتفاق کیا گیا ہے۔معاہدہ کی دفعات درج ذیل ہیں:

(۱) ان کی جان محفوظ رہے گی۔
(۲) ان کی زمین جائداد اور مال وغیرہ ان کے قبضے میں رہے گا۔
(۳) ان کے کسی مذہبی نظام میں تبدیلی نہ کی جائے گی۔ مذہبی عہدے دار اپنے اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے۔
(۴) صلیبوں اور عورتوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔
(۵) ان کی کسی چیز پر قبضہ نہ کیا جائے گا۔
(۶) ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی۔
(۷) اور نہ پیداوار کا عشر لیا جائے گا۔
(۸) ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے گی۔
(۹) ان کے معاملات اور مقدمات میں پورا انصاف کیا جائے گا۔
(۱۰) ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہونے پائے گا۔
(۱۱) سودخواری کی اجازت نہ ہوگی۔
(۱۲) کوئی نا کردہ گناہ کسی مجرم کے بدلے میں نہ پکڑا جائے گا۔
(۱۳) اور نہ کوئی ظالمانہ زحمت دی جائے گی۔ (دین رحمت: ۲۳۹، بحوالہ: فتوح البلدان بلاذری)

مذکورہ بالا جو حقوق اسلام نے دیگر اقوام اور رعایا کو عطا کیے ہیں ان سے زیادہ حقوق تو کوئی اپنی حکومت بھی نہیں دے سکتی۔

جو غیر مسلم اسلامی حکومت میں رہتے ہیں اس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ اللہ ورسول کی پناہ میں ہیں اسی لیے ان کو ذمی کہا جاتا ہے اسلامی قانون یہ ہے کہ جو غیر مسلم (ذمی) مسلمانوں کی ذمہ داری میں ہیں ان پر کوئی ظلم ہو تو اس کی مدافعت مسلمانوں پر ایسی ہی لازم ہے جیسی خود مسلمانوں پر ظلم ہو تو اس کا دفع کرنا ضروری ہے۔ (المبسوط للسرخسی: ۱/۸۵)

منافقین کے ساتھ حسن سلوک:

مدینہ منورہ میں ایک طبقہ ان مفاد پرستوں کا بھی پیدا ہوگیا تھا جو زبان سے ایمان لے آیا تھا

مگر دل ایمان ویقین سے یکسر خالی تھے، یہ لوگ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر بظاہر مسلمانوں کے ساتھ ہوگئے تھے، مسلمانوں کے تئیں سخت کینہ، بغض اور حسد رکھتے تھے، ان کا سربراہ عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا، یہ مدینہ کا بااثر آدمی تھا اور سرکار دوعالم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ کے لوگ اس کو حکمراں بنانے کی تیاری کررہے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد اس کی آرزو خاک میں مل گئی۔ اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے کے باوجود دل سے کافر ہی رہا، منافقین نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی تمام تر کوششیں کیں، نبی رحمت ﷺ کی شان میں گستاخیاں کیں، کافروں اور یہودیوں سے مل کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے منصوبے تیار کیے، ان سب شرارتوں اور عداوتوں کے باوجود سرکار دوعالم ﷺ اور مسلمانوں نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق اور رواداری ہی کا معاملہ فرمایا عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ بھی سرکار دوعالم ﷺ نے پڑھائی۔ ان کے لڑکے کی درخواست پر اپنا جبہ مبارکہ اس کے کفن کے لیے مرحمت فرمایا۔

اسلامی حکومت میں غیرمسلم رعایا (ذمیوں) کے حقوق:

اسلام تمام افراد بشر اور طبقات انسانی کے لیے رحمت ورافت کا پیکر بن کر آیا تھا، اس لیے اس نے غیرمسلم اقوام اور رعایا کے ساتھ مثالی رحم وکرم، مساوات وہمدردی، اور رواداری کا معاملہ کیا ہے اور ان کو انسانی تاریخ میں پہلی بار وہ سماجی اور قومی حقوق عطا کیے جو کسی مذہب یا تمدن والوں نے دوسرے مذہب وتمدن والوں کو کبھی نہیں دیئے۔ جو غیرمسلم اسلامی ریاست میں قیام پذیر ہوں اسلام نے ان کی جان، مال، عزت وآبرو اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ اور حکمرانوں کو پابند کیا ہے کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے مساوی سلوک کیا جائے۔ ان غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی پناہ میں ہیں۔ اس بنا پر اسلامی قانون ہے کہ جو غیرمسلم، مسلمانوں کی ذمہ داری میں ہیں ان پر کوئی ظلم ہو تو اس کی مدافعت مسلمانوں پر ایسی ہی لازم ہے جیسی خود مسلمانوں پر ظلم ہو تو اس کا دفع کرنا ضروری ہے۔ (مبسوط سرخسیؒ: ۸۵/۱)

اگر کوئی مسلمان ذمی پر ظلم کرتا ہے تو یہ مسلمان پر ظلم کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ (درمختار مع ردالمحتار: ۳۹۶/۵)

جو حقوق مسلمانوں کو حاصل ہیں وہی حقوق ذمیوں کو بھی حاصل ہوں گے، نیز جو واجبات

مسلمانوں پر ہیں وہی واجبات ذمی پر بھی ہیں۔ ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کی طرح محفوظ ہے اوران کے مال ہمارے مال کی طرح محفوظ ہے۔(درمختار کتاب الجہاد)

اسلام نے طے کیا ہے کہ جو شخص اس غیر مسلم کو قتل کرے گا جس سے معاہدہ ہوچکا ہے وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا جب کہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔(حدیث شریف: ابن کثیر: ۲/۲۸۹)

ذمیوں کے اموال اور املاک کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

سرکاردوعالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: سنو جو کسی معاہد (غیر مسلم) پر ظلم کرے، یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا، یا طاقت سے زیادہ اس کو مکلّف کرے گا یا اس کی کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے دعوے دار بنوں گا۔(مشکاۃ شریف: ص:۳۵۴)

غیر مسلم رعایا کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ ان کے تعلیمی ادارے آزاد ہوتے اوران کے شخصی قوانین کے لیے عدالتیں بھی آزاد رہیں۔

ذمیوں کو جو حقوق اسلام میں عطا کیے گئے ہیں وہ معاہدۂ اہل نجران کے ضمن میں تفصیل سے بیان کئے جاچکے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات:

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار مظالم کے پہاڑ توڑ رہے تھے،ان کا جینا دوبھر کردیا تھا ہر طرح سے ان کو پریشان کیا جارہا تھا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ چلے جانے کے بعد بھی سکون میسر نہ آیا، اور کفار یہود اور منافقین کی مشترکہ سازشوں کا شکار رہے۔ مدینہ کو تاخت وتاراج کرنے اور مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے ارادے سے ایک لشکر جرار نے مدینہ پر چڑھائی کردی اس انتہائی مجبوری کی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ تلوار کا مقابلہ تلوار سے کیا جائے چناں چہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت دی اور فرمایا: حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اس واسطہ کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے وہ لوگ، جن کو نکالا گیا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے، کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔(سورہ حج: آیت: ۳۹)

جہاد کی اجازت ظلم وستم کے مقابلہ کے لیے دی گئی اور برسرپیکار لوگوں کے سلسلہ میں بے

نظیر رواداری اورحسن اخلاق کی تعلیم بھی دی گئی جو کسی بھی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی چناں چہ اس سلسلہ میں ہدایات درج ذیل ہیں:

(۱) جنگ میں خود پیش قدمی سے روکا (بقرہ:۱۹۱)

(۲) ظلم وزیادتی کی ممانعت کی (بقرہ:۱۹۰)

(۳) جنگ کی بس اس وقت تک اجازت دی جب تک فتنہ وفساد فرو نہ ہوجائے (حج:۱۳۹)

(۴) دشمن کے قاصدوں کو امن دیا (ہدایہ ونہایہ:۳/۴۷)

(۵) دشمن کی عورتوں، بچوں، معذوروں، کو مارنے سے منع کیا (تاریخ ابن خلدون:۲/۴۸۹)

(۶) سرسبز کھیتوں اور پھل دار درختوں کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی (تاریخ ابن خلدون:۲/۴۸۹)

(۷) عبادت گاہوں کو ڈھانے اور تارک الدنیا عابدوں اور مذہبی رہنماؤں کو قتل کرنے سے روکا (ایضاً)

(۸) اسیران جنگ کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت فرمائی۔

(۹) دشمن اپنے کو کم زور دیکھ کر صلح کی درخواست کرے تو اسے قبول کرنے کی ہدایت فرمائی۔

(۱۰) پناہ میں آنے والے غیر مسلم کو امن دینے اور عافیت سے رکھنے کی تاکید فرئی۔ (سورۂ توبہ:۶۳)

(۱۱) محض مال غنیمت کے لیے جہاد کرنے سے روکا۔ (ابوداؤد:۱/۳۴۸)

(۱۲) لوٹ کے مال کو حرام قرار دیا۔ (تاریخ ابن خلدون)

(۱۳) معاہدہ کرنے والے ذمیوں کی جان ومال کی پوری حفاظت کا مسلمانوں کو پابند فرمایا۔ (دین رحمت:۲۳۹، بحوالہ فتوح البلدان)

وطن کی محبت اسلام میں:

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو دنیا میں جینے اور زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیشہ ہی غذا کی ضرورت پڑتی ہے انسان کو یہ غذا زمین سے حاصل ہوتی ہے اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے، سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ دوسری آیت شریفہ میں ارشاد فرمایا ہے: ہم نے تم کو زمین میں ٹھہرایا اور تمہارے لیے زندگی کے سامان زمین سے پیدا کیئے (سورۂ اعراف) دوسری آیت کریمہ میں ارشاد ربانی ہے: تم زمین میں ہی زندگی بسر کروگے اور زمین میں ہی مروگے اور زمین میں سے ہی نکالے جاؤگے (سورۂ

اعراف) جس زمین سے آدمی کا خمیر اٹھا ہے جہاں وہ پیدا ہوا اور زندگی بسر کر رہا ہے اس سے انسان کو فطری لگاؤ اور تعلق ہوتا ہے، اسی لیے عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے: انسان کی پیدائشی سرزمین اس کی دودھ پلانے والی ماں ہے، مشہور حکیمانہ جملہ ہے: **حب الوطن من الایمان**: وطن کی محبت ایمان کا تقاضا ہے۔

سرورعالم ﷺ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ سے جانے لگے تو فرمایا کرتے تھے: اے مکہ تو خدا کا شہر ہے تو مجھے کس قدر محبوب ہے، اے کاش تیرے باشندے مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو میں تجھ کو نہ چھوڑتا۔ (جمع الفوائد:۱/۱۹۵)

جب سرورعالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو وطن بنالیا تو دعا میں فرمایا کرتے تھے: اے اللہ ہمارے اندر مدینے کی اتنی محبت پیدا کردے جتنی تو نے مکہ کی محبت دی ہے، مدینے کی آب وہوا درست فرمادے اور ہمارے لیے مدینے کے صاع اور مد (ناپنے کے پیمانے) میں برکت عطا فرما اور مدینہ کے بخار کو (حجفہ مقام) کی طرف منتقل فرمادے۔ (بخاری شریف:۱/۵۵۸)

اس حدیث شریف سے وطن عزیز کی محبت کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے نیز اس کی اقتصادی ترقی اور آب وہوا کی درستگی اور صحت وعافیت کی بحالی کی شدید رغبت بھی ظاہر ہوئی ہے، اس لیے وطن مالوف کی محبت فطری تقاضا بھی ہے اور شرعی بھی۔

ہندوستان کی فضیلت:

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ، صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند رقم طراز ہیں:

”اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی سکونت کی، اور یہاں ہی سے ان کی نسل دنیا میں پھیلی اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے“۔ (ہمارا ہندوستان اور اسکے فضائل، بحوالہ تفسیر ابن کثیرؒ:۱/۸۰)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:

”ہندوستان نبوت کا دارالخلافہ ہے، یہاں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تشریف لائے حضرت شیث علیہ السلام دوسرے رسول تھے جو اس سرزمین پر وارد

ہوئے ان کی قبر شریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اجودھیا میں ہے''۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کے نام ادب سے لیے جائیں اور ان کے ساتھ گستاخی نہ کی جائے۔ (قومی اتحاد: ص:۷)

حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(۱) انسانیت کا دارالخلافہ ہندوستان ہے۔

(۲) چوں کہ خلیفہ نبی تھا جس کے پاس حضرت جبرئیل تشریف لایا کرتے تھے لہٰذا سرزمین ہند سب سے پہلے آفتاب نبوت کا مشرق بنا۔

(۳) اسی سرزمین پر سب سے پہلے حضرت جبرئیل کا نزول ہوا۔

(۴) ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے جسم کا خمیر ''وجنی'' نامی علاقے کی خاک سے بنایا ہے۔ لہٰذا ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ سب سے پہلے نبی ﷺ کا خمیر یہیں کی خاک سے بنایا گیا اور حضرت آدم تمام انسانوں کے ابوالآباء تھے اس لیے جملہ انبیاء اور تمام انسانوں کے روحانی اور مادّی اصل واصول کا خمیر ہندوستان ہی سے بنایا گیا، توالد وتناسل کے اصول پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جملہ انبیاء، اولیاء اور صلحاء کرام علماء ومشائخ کا اوّلین عنصر اسی خاک پاک سے وجود پذیر ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ عہدِ الست ہندوستان کے مقام وجنی میں ہی لیا گیا۔ اللہ نے تمام انسانوں کی روحوں کو حضرت آدم کی پشت سے برآمد کرکے ان کو خطاب کیا اور فرمایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تمام روحوں نے متفقہ طور پر اللہ کی پروردگاری کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ضرور آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں۔ (ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل)

وطن عزیز ہندوستان میں مسلمانوں کے ملکی فرائض:

محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

''ہندوستان یا کسی دوسرے غیر مسلم اکثریت والے ملک میں ہر مسلمان اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اسلام نے عام انسانوں کے لیے امن اور آزادی کے جو حقوق تسلیم کیے ہیں اپنے اختیار اور اپنی طاقت کی حد تک ان حقوق کی حفاظت کرے ظاہر ہے اس مقصد کے تحت ہر مسلمان کو ملک کی

سیاسی، معاشی اور شہری سرگرمیوں میں بقدر طاقت حصہ لینا پڑے گا، تاکہ اپنے ہاتھ میں سیاسی اور معاشی قوت کے ذریعہ وہ ملک کے عام باشندوں کی جان ومال اور روٹی کپڑے کے حقوق کی حفاظت کا اپنے وسائل کی حد تک فرض انجام دے سکے۔ ایک مسلمان اگر محض تماشائی بن کر زندگی گذارنا چاہے اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں اور معاشی واقتصادی جدوجہد سے کنارہ کش رہے تو وہ خدا کے عام بندوں کی خدمت کا فرض کیسے ادا کرسکتا ہے۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کے ملکی فرائض)

ہمارے اکابر علماء کرام اور عام مسلمانوں نے ہمیشہ ملک میں محبت واتحاد، حسن معاشرت، فرقہ وارانہ یگانگت اور قومی یک جہتی ورواداری کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''ہم باشندگانِ ہندوستان بحیثیت ہندوستانی ہونے کے، ایک اشتراک رکھتے ہیں، جو کہ اختلافِ مذاہب اور اختلاف تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے جس طرح ہماری صورتوں کے اختلافات ذاتوں اور صورتوں کے تباین، رنگتوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترکہ انسانیت میں فرق نہیں آتا اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں۔

لہٰذا وطنی منافع کے حصول اور مضرتوں کے ازالے کا فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا اس کے لیے سب کو مل کر پوری طرح کوشش کرنی ازبس ضروری ہے، اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں تو تمام گاؤں برباد ہوجائے گا، اور سبھی کے لیے زندگی وبال ہوجائے گی۔ اسی طرح ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑجائے، تو مشترکہ قوت سے اس کے دور کرنے کی جدوجہد کریں اشتراک وطن کے فرائض سب پر یکساں عائد ہوتے ہیں، مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، ہر ایک اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کے ایسے فرائض کو انجام دے سکتا ہے، یہی اشتراک، میونسپل بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے، اور مختلف المذاہب ممبر فرائضِ شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ متحدہ قومیت کے ہیں۔ (ماخوذ از خطبات فدائے ملت: ص:۱۶، ۲۱۵)

❁ ❁ ❁

مجرّد عقل و تجربہ نے ۳۰۰ سال میں ایسی دنیا بنائی ہے

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

جس طرح آج ہمارے ملک میں ایک ''چمکتا بھارت'' اور ایک ''سسکتا بھارت'' ساتھ ساتھ نظر آرہے ہیں وہی حال پوری دنیا اور دنیا کے ہر ملک کا ہے۔ جب سے دین کی رہنمائی کو بطور نظام زندگی بن باس دے کر خود ساختہ ملکی، معاشرتی، سیاسی قوانین بنائے گئے اور انھیں کی بنیادوں پر انسانی معاشرہ اٹھان پا رہے ہیں اور ملک بن رہے ہیں تبھی سے چمکتی دنیا اور سسکتی دنیا دونوں ہی مجموعی طور پر مضطرب اور پریشان ہیں۔ صرف عقل اور تجربہ کی رہنمائی میں انسانی زندگی کا سفر طے کرکے انسانیت کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کا دعویٰ کرنے والے نظریات کی کارگذاری ہمارے سامنے ہے۔ بظاہر تمام چمک دمک، ترقی کے دعوی، ٹیلی مواصلات کے حیرت انگیز نظام، علاج و معالجہ کی بے مثال سہولتوں، تعلیم و ٹکنالوجی کی حیران کن پیش قدمیوں کے باوجود انسان پریشان ہے۔ انڈیا بھی پریشان ہے بھارت بھی پریشان ہے۔ یوروپ اور امریکہ کی پریشانیاں الگ ہیں اور اس کے مظاہر الگ ہیں ایشیا اور افریقہ کے مسائل الگ ہیں اور ان کا اظہار بھی الگ طرح سے ہو رہا ہے۔ انسان، انسانیت اور انسانی قدریں سب سے زیادہ سستی ہوگئی ہیں، انسانی جان کی قیمت نہیں رہی، انسانی جذبات، احساسات، محبت و مروّت، خلوص سب بے قیمت سکہ ہوگئے ہیں۔ بے غیرتی، بے شرمی، بے حیائی، لوٹ کھسوٹ اور طاقت کی فرمانروائی ہی سکہ ہائے رائج الوقت ہوگئے ہیں اور اس سب کے نتیجہ میں دنیا بھر میں انسانی معاشرہ میں ہمہ جہت، ہمہ گیر فساد پیدا ہو رہا ہے۔ نئے ورلڈ آرڈر کے ٹھیکہ دار حیران ہیں کہ ان کے مالیاتی نظام کا بلبلہ کیسے پھوٹ گیا، کیسے عقل کی رہنمائی اور کھاؤ پیو موج کرو کے فلسفہ کے تحت دنیا فقید المثال غذائی بحران، پینے کے پانی کے بحران، ماحولیاتی تبدیلی کے بحران، گلوبل وارمنگ کے بحران، عالمی

کساد بازاری کے بحران، سماجی رشتوں کی بے حرمتی کے بحران، خودکشیوں اور برادرکشیوں کی وبار وغیرہ وغیرہ میں مبتلا ہے۔ انسانیت کے بڑوں کو غور کرنا ہوگا کہ کیا یہ دنیا جو ۳۰۰ سال کے خدا بیزار، سائنس پرست عقل پرست تجربہ کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے کیا یہی آئیڈیل دنیا ہے؟ کیا دنیا کے تمام انسانوں کی اکثریت کی ۳۰۰ سال کی کاوشوں کا ثمر یہی فتنۂ وفساد، مے وقمار وہجومِ زنان بازاری سے پر یہی دنیا انسانیت کی معراج ہے؟ آگے کچھ صفحات میں پیش کیے گئے اعداد وشمار انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی ناکامی کی کہانی خود کہتے ہیں:

- صرف دہلی میں طلاق کی تعداد ۲۰۰۳ء میں ۷۰۰۰ سالانہ تھی۔ ۲۰۰۸ء میں بڑھ کر ۸۵۴۳ ہوگئی۔
- یورپ میں ہر ۳۰ سکنڈ میں ایک حمل گرایا جاتا ہے۔ ہر سال ۱۴۲ملین حمل گرائے جاتے ہیں۔ ہر ۳۰ سکنڈ بعد ایک شادی ٹوٹتی ہے۔ ہر تین گھروں میں سے دو گھروں میں بچہ نہیں ہے (Institute for Family Policy-London)
- ہندو شادی قانون Hindu Marriage Act گھروں کو جوڑ نہیں توڑ رہا ہے۔
(Supreme Court of India - 17.5.2008)
- ترقی وآزادئ نسواں برطانیہ میں C-vote کے ذریعہ کرائے گئے سروے میں پتہ چلا کہ وہاں کالج سے فارغ ہوتے ٪۵۰ لڑکیاں اپنی عصمت گنوا چکی ہوتی ہیں۔ ہر ۲۳ لڑکی میں سے ایک اسقاط گرا چکی ہے۔ سب سے کم عمر کا اسقاط ۱۲ سالہ لڑکی نے گرایا ہے۔
- ہمارے ملک میں TOI کے سروے میں طلبا کی ٪۳۰ تعداد نے کہا کہ اساتذہ کو خوش کرکے نمبر وغیرہ بڑھوانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتیں۔ امریکہ کی ایک طالبہ نے اپنی اسکول فیس جمع کرنے کے لیے نہایت ماڈرن طریقہ سے انٹرنیٹ پر ''کنوارے پن برائے فروخت'' کا اشتہار دے کر انجام دیا۔ جس کے لیے کروڑوں ڈالر کی آفر آگئی۔ مگر کسی نے بھی عصمت کو محفوظ رکھتے ہوئے مدد کرنے کی پیشکش نہیں کی۔
- انگلینڈ میں ہاؤس آف کامنز میں پیش شدہ بل کے پاس ہوجانے کے بعد ہم جنس پرستی یا اس میں ملوث افراد کو برا بھلا کہنے پر سات سال کی سزا دی جاسکے گی۔
- ایک امریکی شہری عام ہندوستانی کے مقابلہ ۱۹ گنا زیادہ کاربن ڈائی آکسائڈ پیدا کرتا ہے۔ دنیا کا درجۂ حرارت Global Warming بڑھانے میں اس گیس کا بڑا رول ہے۔ اس

کے نتیجہ میں:

(۱) ہمالیائی اور قطب جنوبی وقطب شمالی کے گلیشیر معمول سے زیادہ رفتار سے پگھل رہا ہے۔

(۲) ہواؤں کا بہاؤ متاثر ہورہا ہے۔

(۳) درجہٴ حرارت بڑھنے سے اناج کی پیداوار متاثر ہورہی ہے۔ ہمارے یہاں اگر درجہٴ حرارت 4.4° C بڑھا تو ہندوستان کی زرعی پیداوار ٪۴۰-۳۰ کم ہوجائے گی۔

(۴) درجہٴ حرارت 2° C اور بڑھ گیا تو مدراس اور ممبئی کے ۷۰ لاکھ لوگ بے گھر ہوجائیں گے۔

(۵) درجہٴ حرارت بڑھنے سے مالدیو پورا اور بنگلہ دیش کا ٪۱۸ علاقہ زیرآب ہوجائے گا۔

(۶) ہمارے ملک میں اناج کی فی کس پیداوار جو ۹۰ کی دہائی میں ۱۷۹ کلو فی کس تھی وہ اب ۱۶۳ کلوگرام فی کس ہوگئی ہے۔

- عورتوں کی مدد کے خاطر بنائے گئے خصوصی قانون 498A کو خواتین ٪۳۰ تعداد نے خانگی جھگڑوں میں غلط طور پر استعمال کیا۔(UNIFEM)
- WHO کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں ۲/ارب لوگ شراب نوشی کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کینسر، امراض جگر وصدر کے خطرات ٪۳۰ تک بڑھ جاتے ہیں۔
- ہندوستان میں ہونے والے سڑک حادثات کا 1/3 شراب پینے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والی کل اموات کا ٪۳.۷ شراب نوشی کی وجہ سے ہوتا ہے۔
- فٹ پاتھ پر رہنے والے ٪۲۰ بچوں کو اپنے قریبی لوگوں کے استحصال کا شکار ہونا پڑتا ہے۔
- بھارت میں ہر سال ۲۰ لاکھ بچیوں کو رحم مادر میں قتل کردیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں پنجاب، ہماچل پردیش، چندی گڑھ، گجرات میں مرد- عورت کا تناسب خطرناک حد تک بگڑ گیا ہے۔ پنجاب کے ایک کنویں میں ایک ساتھ ۱۳۵ سفات شدہ مادہ جنین برآمد کیے گئے۔(11.8.2006)
- ہندوستان میں National Aids Control Organization (NACO) پہلے ہی یہ مانگ کرچکا ہے کہ جسم فروشی کو قانونی پیشہ کا درجہ دے دیا جائے۔ پلاننگ کمیشن کی ممبر سیدہ حمیدین نے بھی مانگ کی اس جرم کو قانونی تحفظ دیا جائے۔(26.6.2006)
- سود Interest اور جوا، جنھیں شریعت حرام قرار دیتی ہے وہ جملہ انسانی مسائل کی جڑ ہیں۔ حالیہ مندی، بینکوں کے دیوالیہ پن، اور اناج اور پیٹرول کی غیر معمولی چڑھی ہوئی قیمتوں

سے نبٹنے کے لیے تمام حکومتیں سود کی شرح کم کررہی ہیں، اناج اور ضروری اشیاء کی تجارت میں سٹہ بازی کی شکلوں کو بند کیا جارہا ہے۔

- غذائی اجناس میں سٹہ بازی کے ذریعہ ان کے دام بڑھائے گئے۔ پیٹرول کی جب پیداوار زیادہ تھی تب دام ۱۵۰ ڈالر فی بیرل تھی اور اب OPEC کے ذریعہ پیداوار کم ہوجانے کے باوجود دام صرف ۵۰ ڈالر فی بیرل کیوں ہے؟
- CRIME-CLOCK 2005 میں ہر ۱۷ سکنڈ میں ایک جرم ہوا۔ ہر پندرہویں منٹ پر ایک چھیڑ چھاڑ کا کیس، ہر ۷۷ منٹ پر جہیزی موت، ہر ۲۹ منٹ پر ایک زنا، ہر ۱۷ منٹ پر ایک قتل، ۶۱ منٹ پر ایک لوٹ اور ہر ۳۱ منٹ پر ایک جنسی تشدد انجام دیا جارہا ہے۔ (NCRB.Delhi)
- ۲۰۰۴ء میں برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد محض ۵ لاکھ تھی۔ ۲۰۰۸ء میں یہ تعداد تمام منفی پروپیگنڈوں اور سازشوں کے باوجود ۲۴ لاکھ ہوگئی۔ یعنی تقریباً ۱۹ لاکھ افراد نے اسلام قبول کیا۔ جو دوسری قوموں سے شرح نمو سے دس گنا زیادہ ہے۔
- دنیا کے دس بڑے مالیاتی ادارہ خلیج میں ہیں جو غیر سودی نظام پر چلائے جارہے ہیں۔ وہ موجودہ اقتصادی بحران کو زیادہ بہتر جھیل پارہے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے سبق لینا چاہیے۔ (Abhishek Singhvi-MP Rajya Sabha)
- اسلام سے نفرت کے ماحول میں دنیا یہ نہیں دیکھ رہی ہے کہ Liberalism اسلامی اقتصادیات وتعلیمات میں موجود ہے۔ اسلام فری economy اور نجی مالکانہ حقوق کو بھی تسلیم کرتا ہے اور غیر منصفانہ نفع پر بھی روک لگاتا ہے۔ (سووک چکرورتی ماہر اقتصادیات)
- ہندوستان میں آزادی کے ۶۰ سال بعد بھی دو ڈالر روزانہ سے کم آمدنی والے افراد کی تعداد ۷۷٪ یعنی ۸۳ کروڑ ۶ لاکھ ہے جب کہ حضرت محمد ﷺ کی رہنمائی میں صرف ۲۳ سال میں یہ نوبت آگئی تھی کہ پوری خلافت میں زکوٰۃ لینے والا مستحق نہیں رہ گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

دارالعلوم کا انعامی جلسہ

مہتمم دارالعلوم مولانا مرغوب الرحمٰن اور مولانا بدرالدین صاحب کی طرف سے انعامات

دارالعلوم کے دارالحدیث ہال میں ۲۰/اور ۲۱/مئی کو مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن کی صدارت میں انعامی جلسہ ہوا، جس میں شعبان ۱۴۲۹ھ کے سالانہ امتحان میں کامیاب ہونے والے اور پورے سال کلاس میں حاضر ہونے والے طلبا کو انعامات سے نوازا گیا، انعام پانے والے طلبا کی مجموعی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار ہے، دارالعلوم نے اس مد پر آٹھ لاکھ پچاس ہزار روپئے خرچ کیے ہیں۔ دورۂ حدیث شریف میں جونپور کے صفوان احمد اول آئے، سہرسہ کے محمد نوشاد، غازی آباد کے محمد شعیب دوسرے نمبر پر رہے جب کہ آسام کے اسداللہ تیسرے نمبر پر رہے۔

۲۰/مئی کی نشست میں صدرالمدرسین حضرت مولانا سعید پالن پوری نے طلبا سے خطاب کیا اور ان کو علم کی فضیلت، حصول علم کی افادیت اور ان کی مستقبل کی ذمہ داریوں سے انھیں آگاہ کرایا، اس موقع پر کارگزار مہتمم مولانا غلام رسول خاموش، نائب مہتمم مولانا عبدالخالق مدراسی، نائب مہتمم مولانا عبدالخالق سنبھلی، اساتذۂ حدیث حضرت مولانا نعمت اللہ، مولانا عبدالحق، قاری محمد عثمان، مولانا قمرالدین، مولانا ریاست علی اور دیگر بہت سے اساتذہ کرام موجود رہے۔

ناظم مجلس تعلیمی حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے، آپ نے اس موقع پر جلسہ انعامیہ کی رپورٹ پڑھ کر سنائی اور انعامات کی تفاصیل کے حوالے سے بتایا کہ اول، دوم، سوم آنے والے طلبا کو حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے خصوصی انعامات سے نوازا جارہا ہے، جب کہ رکن شوریٰ حضرت مولانا بدرالدین اجمل کی طرف سے ۵۹ لڑکوں کو خصوصی انعامات دیے جارہے ہیں۔ ان میں اترپردیش، بہار، آسام اور آندھراپردیش کے طلبا شامل ہیں۔

جلسہ کا آغاز قاری شفیق الرحمٰن صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

پورے سال میں ایک گھنٹہ بھی غیر حاضر نہ رہنے والے طلبا کی تعداد ۲۲۲ ہے، ان کو فی فرد ۵۰۰ روپئے دارالعلوم کی طرف سے اور مزید ۵۰۰ روپئے مولانا بدرالدین اجمل کی طرف سے دیے گئے، جب کہ پورے سال میں ایک گھنٹہ کی غیر حاضری کرنے والے ۴۰ طلبا کو ۲۵۰ روپئے فی

طالب علم نقد انعام دارالعلوم کی طرف سے اور مزید ۲۵۰ روپئے فی طالب علم نقد انعام رکن شوریٰ مولانا بدرالدین اجمل کی طرف سے دیا گیا۔

دوروزہ اجلاس میں دارالعلوم کے تقریباً ڈھائی ہزار طلبا کو انعامات سے نوازا گیا، انعامات میں کتابیں دی گئیں، ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

رحمۃ للعالمین، آئینۂ حقیقت نما، اشاعت اسلام، علوم القرآن، حیات المسلمین، انوارالمناسک، سیرۃ المصطفیٰ، عمدۃ القاری، فتاویٰ شامی، البحر الرائق، بدائع الصنائع، روح المعانی، اعراب القرآن وغیرہ۔

۲۰/مئی کی شام کی نشست میں قاری عبدالرؤف صاحب کی تلاوت کلام پاک سے کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ ۲۱/مئی کی نشست کا آغاز قاری آفتاب عالم صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

طلبا کے نام پکار کر انعام دینے والوں میں مولانا مجیب اللہ صاحب، مفتی خورشید انور صاحب، مولانا خضر محمد کشمیری، مولانا منیرالدین احمد عثمانی، مولانا عبداللہ معروفی، مولانا سلمان صاحب بجنوری اور مولانا حسین احمد ہریدواری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

انعامات پانے والے طلبا کی تفصیل درج ذیل ہے:

سال ہفتم	۵۶۰	سال ششم	۳۹۰
سال پنجم	۲۵۹	سال چہارم	۱۵۸
سال سوم	۱۲۳	سال دوم	۳۲
تجوید القرآن کے انعام یافتگان کی تعداد			۲۱۰
حفظ	۲۱۵	ناظرہ	۱۹۳
شعبۂ دینیات	۹۷		

جاری کردہ: دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند

(مولانا) عبدالخالق مدراسی

نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند